بیسویں صدی

مترجم

راہل سانکرتیاین - طفیل احمد خاں

# ۲۲ بائیسویں صدی

راہل سانکرتیاین

کتاب محل۔ الہ آباد

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No. 019913
MAILSI

مترجمہ طفیل احمد خاں بی۔اے و حامد واحدی

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

۸۹۱۰ ۳۵
ط ۲ ب
طفیل احمد خاں

مطبوعہ۔ مشن پریس۔ الٰہ آباد

# پیش لفظ

سنہ ۱۹۱۸ء کا اپریل یا مئی کا مہینہ تھا رات کے پچھلے پہر شنو بند ہو کا یہ سیر و سیاحت کا بیان بیداری یا خواب نہ معلوم کس حالت میں دماغ میں وارد ہوا۔ اسی وقت باقاعدہ اور سلسلہ وار اس کا ایک مختصر خاکہ تیار کیا گیا۔ لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے اسے پھیلا کر تفصیل سے شائع نہ کیا جا سکا وہ مختصر بیان ایک دوست کی لاپرواہی سے کھو گیا بہت عرصہ تک انتظار کرنے کے باوجود بھی جب اس کے ملنے کی امید بالکل نہ رہی تو یادداشت سے جہاں تک ہو سکا نہایت اختصار کے ساتھ یہ تذکرہ ہزاری باغ جیل میں ۹ر فروری سنہ ۱۹۲۴ء میں تحریر کیا گیا۔ اور خاص خاص حصوں میں کوئی ردّ و بدل نہیں کیا گیا ہے لیکن خارجی باتوں میں ہو سکتا ہے کچھ ترمیم و تنسیخ سے کام لیا گیا ہو۔

کس غرض سے یہ کتاب لکھی گئی ہے اور کس حد تک اس میں کامیابی ہوئی اس کا فیصلہ ناظرین ہی پر چھوڑا جاتا ہے۔

اس تیسرے ایڈیشن میں بغیر کسی خاص تبدیلی کے کچھ اصلاحیں کی گئی ہیں۔ بائیسویں صدی کا پیغام دینے والی "سوویت سرزمین" موجود ہے۔ اس سے پتہ لگ سکتا ہے کہ دنیا کس طرف جا رہی ہے۔

راہول سنکرتاین

## مضامین

صفحے

# باب اوّل

# ایک طویل خواب کا اختتام

یہاں اتنے موٹے موٹے درخت پہلے کہاں تھے۔ یہ بڑا سا چٹان بھی یہاں پر نہیں تھا۔ شاید اوپر سے ٹوٹ کر آگرا ہے لیکن بیچ میں ایک اونچے چٹان کے حائل ہو جانے سے باگمتی میں نہیں گر سکا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ چٹان یہاں پر آیا کیوں کر؟ راستے میں یہ موٹے موٹے تناور درخت جو کھڑے ہیں۔ شاید یہ درخت بعد میں اُگ آئے ہوں اور یہ شکل و شباہت سے سو سال پہلے کے معلوم ہوتے ہیں۔ تو اس کے یہ معنی ہوئے یہاں مجھے آئے اتنے دن ہو گئے۔ اب مجھے یاد آرہا ہے۔ فروری ۱۹۲۴ء میں مَیں یہاں آیا تھا۔ اگر درمیان میں سو سال گزر چکے ہیں تو یہ ۲۰۲۴ء ہے۔

اب تو یہاں سے اُترنا بھی مشکل ہے۔ باگ متی ندی ہاتھوں نیچے چلی گئی ہے۔ یہاں پر وہ کنارے والا چٹان بھی نہیں ہے جس کے زینہ سے چڑھ کر میں یہاں آیا تھا۔ یہاں پر پانی کے بہنے سے ایک نالی سی بن گئی ہے۔ لیکن کہسار کا جوبن دوبالا ہو گیا ہے۔ چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے اور۔ وہ چشمہ یہ تو چھوٹا سا آبشار بن گیا ہے۔ اہا! ادھر تو اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے آبشار نظر آرہے ہیں۔ لیکن باگ متی کا گیت اسی طرح جاری ہے۔ دور ایک چٹان کے ہٹنے اور کچھ نیچے چلے جانے کے علاوہ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن وہ درخت کہاں ہے جو کنارہ پر کھڑا تھا، دراصل میرا جانا پہچانا درخت یہاں پر اب ایک بھی نہیں۔ جب یہاں اتنی تبدیلی ہو گئی ہے تو آبادیوں میں نہ معلوم کیا ہوا ہوگا۔ بڑی حیرت ہو رہی ہے۔

دیکھنا چاہئے۔ انسانی دنیا کیا کیا روپ بدلتی ہے۔ راستہ بھیم پھیری ہو کر گیا تھا۔ وہاں کچھ لوگ ضرور رہوں گے۔ ان سے بھی کچھ پتہ ملیگا۔

یہ سوچ کر میں اپنے چیر کے گپھا سے نکلا۔ اس گپھ سے بیس پچیس ہاتھ نیچے آئے ہی مجھے سخت دقت اٹھانی پڑی "میرے جسم پر کوئی لباس نہیں وہ سب مدت ہوئی سڑ گل گئے۔ لیکن آدمیوں میں جانا ہے جسم ڈھانکنے کے لئے کچھ نہ کچھ ہونا چاہئے"۔ میں نے ایک درخت سے بڑے بڑے پتے توڑ کر جنگلی لتر سے کمر میں باندھ لئے۔ نیچے آنے کے بعد ندی کے کنارے کنارے ہی چلنا زیادہ مناسب معلوم ہوا۔ مجھے شک ہونے لگا کہ نزدیک والا راستہ شاید صاف نہیں ہے۔ گنگا کے کنارے آنے کے بعد پہلی خواہش میرے دل میں ہوئی کہ غسل کروں۔ آفتاب کی تیز کرنیں سامنے جگمگا رہی تھیں اور دن دو تین گھنٹے اوپر چڑھ آیا تھا۔ لیکن ابھی ہلکی ہلکی پہاڑی سردی فضا میں تیر رہی تھی۔ پھر بھی میں نے جی بھر کے غسل کیا۔ نہانے، دھونے کے بعد سامنے کچھ اس قسم کے پھل نظر آ گئے جنھیں میں جانتا تھا۔ میں نے توڑ کر جی بھر کر کھایا۔ اس طرح پیٹ کے دھندے سے بے فکر ہو کر آگے قدم بڑھائے۔

جب میں پہلی بار یہاں آیا تھا تو میری عمر ساٹھ، اکسٹھ سال کی تھی۔ بال سفید ہو چلے تھے لیکن اب تو تمام بال سن کی طرح سفید ہو گئے تھے۔ عرصہ طویل تک بھوکے رہنے سے بدن سوکھ گیا تھا لیکن ہمت اور پھرتی میں کمی نہیں واقع ہوئی تھی۔ چلتے چلتے چار پانچ گھنٹے گذر گئے۔ چھ سات کوس چلنے کے بعد سر کے اوپر تار نظر آنے لگے۔ دھوپ میں ان کی چمک سے معلوم ہوا کہ تار تانبے کے ہیں۔ تانبے کے تار اس زمانہ میں نظر نہیں آتے تھے۔ اسلئے یہ مجھے ایک نیا التزام معلوم ہوا۔ میں نے سوچا۔ شاید اس طرف کہیں بجلی پیدا کی جاتی ہے جو ان تاروں کے ذریعہ اور مقامات پر پہنچائی جاتی ہوگی۔ اب آگے آس پاس کی پہاڑیوں پر دونوں طرف انار، نارنگی اور کیلے کے باغات کا سلسلہ شروع ہوا۔ کوسوں تک کسی آدمی کا پتہ نہیں تھا۔ باغیچہ سے ہو کر ایک راستہ نظر آیا۔ میرے دماغ میں چلنے کا خیال پیدا ہوا شاید

اسی طرح جلدی کوئی آدمی مل جائے میں نے ندی کا کنارہ چھوڑ کر اوپر کا راستہ پکڑا اور نارنگی کے درختوں کے سائے میں چلنا شروع کیا۔ درخت پھلوں سے لدے تھے اور خوب بڑے بڑے پھلوں سے پھر ان کے حسن اور دلکشی کا کیا کہنا تھا۔ خیال آیا کہ آگے کوئی رکھوالا ملے تو اس سے پوچھوں۔ میں جتنا آگے بڑھتا جاتا تھا میری حیرت اور بڑھتی جاتی تھی۔

نارنگی کے باغوں کا سلسلہ ختم ہوگیا اور سیبوں کا شروع ہوا۔ یہ بات نیپال کے سلسلے میں مجھے نئی معلوم ہوئی۔ سیب بڑے بڑے تھے اور خوب پھلے ہوئے تھے اور باغات بھی پہاڑوں کے ساتھ ساتھ اوپر چوٹی تک چلے گئے تھے۔ جگہ جگہ برساتی پانی کے بہنے کے لئے نالیاں اور نل بنا دیے گئے تھے۔ موٹے موٹے نلوں سے پانی ہر جگہ پہنچایا گیا تھا۔ کہیں کہیں پینے کے بھی نل نظر آتے تھے۔ راستے سے کچھ ہٹ کر ایک آدھ چھوٹے چھوٹے ٹین کے مکان کھڑے نظر آئے۔ لیکن میں نے راستہ چھوڑ کر اس طرف جانا پسند نہ کیا۔ سوچا ابھی آگے چلے چلیں۔ کہیں نہ کہیں راستہ میں کوئی مل جائیگا۔

پورے چار کوس چلنے کے بعد آخر آدمیوں کی آواز سُنائی دی۔ جوں جوں نزدیک ہوتا گیا آواز صاف ہوتی گئی۔ جب قریب آیا تو دیکھا کہ اُن میں مرد و عورت دونوں ہیں۔ ان کے لباس بہت صاف اور سادہ اور چہرے کھِلے ہوئے تھے۔ میں نے خیال کیا یہ لوگ نیپال کے شاہی خاندان کے افراد ہیں جو شاید سیر و تفریح کے لئے یہاں آئے ہیں۔ لیکن یہ ٹوکریوں میں پھلوں کو توڑ توڑ کر زمین پر رکھتے جاتے ہیں اور کچھ لوگ انھیں پھلوں کو سامنے لئے جا رہے ہیں۔ معلوم ہو رہا ہے وہاں وہ لوگ پھلوں کا ڈھیر لگائے رہی ہیں اس کے علاوہ شاہی خاندان کا بیس گزی پائجامہ بھی ان عورتوں کے زیب تن نہیں ہے۔ پھر اُن کا رنگ روپ پوشاک اور گٹھا ہوا بدن اور ان کی صفائی وغیرہ ان سے کہیں اعلیٰ درجہ کی ہے۔ یہ بڑی حیرت کی بات ہے یہ سب کی سب پتلون پہنے ہوئی ہیں۔ ان کے ہاتھ پیر میں موزے اور دستانے ہیں۔ پاؤں میں جوتے بھی ہیں اس میں یقیناً

کوئی بھید ہے۔ اچھا ان سے مل کر ہی پتہ چلے گا اور اب تو بالکل قریب ہی آ گیا ہوں۔ کام میں لگے رہنے کی وجہ سے انھوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ لیکن وہ دیکھو وہاں ایک نے مجھے دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ اب سب کے سب میری طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ کیا میں کوئی نمائشی چیز ہوں کوئی میرے پتوں کے کپڑے کی طرف دیکھ رہا ہے تو کوئی ڈاڑھی کی طرف، اچھا ایک آدمی ادھر آ رہا ہے۔ اسی سے سب باتیں معلوم ہو جائیں گی۔

اگرچہ آنے والا بالکل سیدھے میری طرف آ رہا تھا لیکن میری حیرت مجھے ادھیڑ بنا رہی تھی۔

# بابِ دوئم

# سیب گاؤں کا باغ

اُس آدمی نے آہستہ سے میرے قریب آکر "خوش آمدید" کہا۔ یہ لفظ ایک ہی بار اُس کے منہ سے نکلا تھا لیکن میرے کانوں میں نہ جانے کتنی بار گونجتا رہا۔ اُس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا "آپ کہاں سے آرہے ہیں"؟

"کہیں دور سے تو نہیں۔ قریب دو گھنٹے دن چڑھا تھا تب میں اپنی جائے قیام سے چلا ہوں"۔

"اب" گھڑی دیکھ کر "تین بج کر بیس منٹ ہو چلے ہیں مجھے معاف کریںگے اگر میری باتوں میں کوئی گستاخی ہو۔ کیوں کہ آپ کے درشن ہی نے جاننے کی خواہشوں سے دل کو ڈانواڈول کر دیا ہے"۔

"جو کہنا ہو بلا تکلف اور اطمینان سے کہو میری حیرت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اگرچہ اس جگہ سے میری جائے قیام بہت دور نہیں ہے۔ لیکن وقت کے اعتبار سے یقیناً دور ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ۔ یہ سنہ اور تاریخ کون ہے"؟

"سنتا لنہ"

"کون سا سنہ"

"عالمگیر، آپ کون سا سنہ پوچھتے ہیں"؟

"عیسوی"

"وہ ہے ۲۱۲۴ء"

"اوہو۔ تو کیا مجھے گپھا میں بیٹھے دو سو سال ہو گئے تبھی تو ہر جگہ تبدیلی ہی تبدیلی نظر آتی ہے۔ اچھا پوچھو جو کچھ پوچھنا ہے"

"کیا آپ کو گپھا میں بیٹھے دو سو سال ہو گئے اور اُس وقت آپ کی عمر کیا رہی ہوگی"

"ساٹھ سال"

"دو سو ساٹھ سال بہت ہوتے ہیں۔ میری عمر ابھی ساٹھ سال کی ہے۔ وردپور میں سو اور ایک سو بیس سال کے کئی آدمی ہیں۔ لیکن آپ کی عمر کا آدمی ابھی تک سننے میں نہیں آیا۔ یہ سب باتیں مجھے اور بھی حیرت میں ڈال رہی ہیں۔ ساتھ ہی دل میں بہت کچھ پوچھنے کی خواہش اُمڈ رہی ہے۔ لیکن وہاں پر جو میرے ساتھی عورتیں اور مرد جمع ہیں وہ بھی مجھ سے کم خواہشمند نہیں ہیں۔ اس لئے کتنا اچھا ہوتا اگر ان کے سامنے ہی آپ اپنا فسانہ حیات سناتے ہاں ایک بات اور اب ایسے لباس کا رواج نہیں رہا۔ غیر مناسب تو نہ ہوگا اگر آپ کے لئے کپڑے لے آؤں"

"نہیں غیر مناسب تو نہیں اس کی ضرورت میں نے بھی محسوس کی تھی"

اُس شریف آدمی نے میرا بیان ختم ہوتے ہی "ارجن ارجن" آواز دی جس کے سنتے ہی ایک نوجوان دوڑتا ہوا آیا۔ اُس نے میرے سامنے آکر میرا خیر مقدم کیا اور اپنے ساتھی سے پوچھا۔ "کیا ہے؟"

"یہاں اس مکان میں دھوتی کے جوڑے رکھے ہوں گے۔ دوڑ کر ان میں ایک لے آیئے آپ کے لئے"

"بہت اچھا" کہہ کر ارجن دوڑ گیا اور دو منٹ میں نہایت صاف ایک دھوتی لے آیا۔

میں نے دھوتی لیتے ہوئے کہا "پہلی بات تو یہ کہ چونکہ ہمیں باتیں بہت کرنی

ہیں۔ اس لئے بہت بہتر ہے کہ ہم ایک دوسرے کا نام جان لیں میرا نام وشوبندھو ہے
اب آپ اپنا نام بتایئے۔"

"میرا نام سُمید ہے"

"تو سُمید جی۔ اس امداد کا شکریہ"

"نہیں ویسی کوئی بات نہیں اب ہم لوگوں کے ناشتہ پانی کا بھی وقت آگیا ہے
آپ بھی تھکے ماندے ہوں گے۔ بھوک کا لگنا بھی قرینِ قیاس ہے۔ ابھی ہم چل کر ناشتہ
کریں اور اس کے بعد آپ اپنا فسانۂ حیات ہمیں سنائیں۔"

"سُمید سچ مچ تمھاری تھوڑی سی گفتگو نے مجھے بہت لبھالیا ہے۔ اس وقت
میری خوشی کی کوئی حد نہیں۔ اچھا چلو"

"اب سمید مجھے ساتھ لے کر اس مکان کی طرف چلے۔ اتنے میں یکایک توپ
کے گولے کی سی آواز ہوئی۔ پہلے تو میں چونک پڑا۔ بعد میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ
یہ ناشتہ کے وقت کی اطلاع ہے۔ مجھے متحیر کرنے والی مختلف چیزوں میں ایک اور چیز
کا اضافہ ہوا میں نے دیکھا کہ اُدھر سے وہ مرد و عورت بھی جو کام میں مصروف تھے۔
اپنا اپنا کام چھوڑ کر اسی مکان کی طرف چلے آرہے ہیں۔ مکان کے پاس جاکر کیا دیکھتا
ہوں کہ صاف پانی کے بہت سے نل لگے ہیں۔ نہانے کے لئے صاف پانی کے ٹب
ہیں۔ مکان بہت صاف ستھرا ہے جس میں چار بڑے بڑے کمرے ہیں۔ ایک ہال ہے
جس میں ڈیڑھ دو سو آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ کمروں میں بہت سی کرسیاں پڑی ہیں۔

میں نے بڑے ہال میں دیکھا۔ قطار در قطار کرسیاں اور میزیں رکھی ہیں میزوں پر
ایک ایک طشتری میں سیب۔ کیلے۔ انگور وغیرہ بہت سے پھل رکھے ہیں۔ اور گلاسوں
میں دودھ ہے۔ ہم سب مرد عورتوں کی تعداد ایک سو تھی۔ میں نے اتنی ہی تھالیاں
بھی وہاں دیکھیں جس سے سخت حیرت ہوئی۔ کیا عورتیں بھی مردوں کے پہلو بہ پہلو

بیٹھ کر ناشتہ کرینگی۔ اتنے میں وہ سب مرد و عورت بھی آ گئے۔ سب نے میرے سامنے آکر میرا خیر مقدم کیا۔ سمیدھ نے انھیں مخاطب کر کے کہا۔

"ساتھیو ہمارے آج کے مہمان کو دیکھ کر سب کو بہت حیرت ہو رہی ہے۔ پھر ہمارے جلیسوں کی جنھوں نے ان کی ایک آدھ بات سن لی ہے ان کی خواہش اور حیرت کی تو اور بھی انتہا نہیں۔ اسی لئے میں نے تنہا سب سُن لینا اچھا نہیں سمجھا۔ ابھی تو صرف اتنا معلوم کر سکا ہوں کہ ہمارے وشو بندھو جی ۱۹۲۴ء ہی سے یہاں سے دس بارہ کوس کے فاصلہ پر براجمان تھے جہاں سے آج ہی آ رہے ہیں"

اتنا سننے کے بعد مرد و عورتوں کا تعجب اور اضطراب اور بھی بڑھ گیا لیکن ناشتہ میں دیر ہو رہی تھی اس لئے تمام لوگ ہاتھ منہ دھو کر اپنی اپنی جگہوں پر جم گئے۔ یہ کہنے کی غالباً ضرورت نہیں کہ ارجن نے میرے ناشتہ کے لئے اسی وقت اطلاع دے دی تھی۔ جب وہ دھوتی لینے آیا تھا۔ سمیدھ نے مجھے ایک کرسی پر بٹھایا اور پاس ہی خود بھی بیٹھ گئے اُن کے قریب ہی ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی جو آگے چل کر معلوم ہوا کہ ان کی ساتھن سمترا تھیں۔ ناشتہ نکالنے والے اپنا کام ختم کر کے خود بھی ایک ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ سب نے کھانا شروع کیا۔ میں نے بھی سیب کی ایک قاش اپنے منہ میں ڈالی۔ مجھے اسکا ذائقہ بہت اچھا معلوم ہوا۔ میں نے تو اُس وقت یہی سمجھا کہ شاید عرصہ دراز کے بعد کھانے سے یہ اتنا لذیذ معلوم ہو رہا ہے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سائنٹفک طریقوں سے پھلوں کی کاشت کا نتیجہ ہے۔ مجھے بہت بھوکا سمجھ کر کچھ زیادہ پھل دیا گیا تھا۔ اس میں نارنگی کی بھی کچھ پھانکیں تھیں۔ نیپال کی نارنگی کھانے کا پہلے بھی اتفاق ہوا تھا لیکن اتنی میٹھی اور خوش ذائقہ نہیں تھی۔ بیج کا تو پتہ ہی نہیں تھا۔ ریشے بھی ندارد۔ انگور کے دانے بنارسی بیروں کے برابر تھے۔ میں نے پوچھا "یہ انگور کہاں کے ہیں"

سمیدھ نے بتایا "یہاں سے چار کوس کے فاصلہ پر اس کا باغ ہے"

"کیا نیپال میں بھی انگور ہوتے ہیں"

"بہت"

"اسکو سینکڑوں سال ہو گئے سارے بہار، اڑیسہ، آدھے بنگال، کاشی اور کوشل کو یہیں سے انگور جاتا ہے۔"

اب ناشتہ کا دور ختم ہو گیا تھا۔ سبھوں نے ہاتھ منہ دھو کر ایک کمرے کی طرف رُخ کیا وہاں بہت سی کرسیاں پڑی تھیں۔ سُمید نے مجھے لے جا کر ایک آرام کرسی پر بٹھایا میں دل ہی دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ ضرور مجھے بیسویں صدی کا جنگلی سمجھتے ہوں گے اور اُس پر طُرّہ یہ کہ اُنھوں نے مجھے پتے پہنے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ دوسرے ان میں سے کسی کو ڈاڑھی رکھنے کا بھی شوق نہیں ہے اور میرے ریچھ کے سے بال!۔

میں نے ان لوگوں کو باغ میں کام کرتے دیکھا تھا۔ اسلئے سمجھ بیٹھا تھا کہ یہ یقیناً مزدور ہیں۔ لیکن اب خواہش ہوئی کہ پوچھوں کہ ان باغوں کا مالک کون ہے۔ لیکن ہمت نہیں ہوئی۔

# باب تیسرا

## ورتمان دنیا

"آپ کی باتیں سننے کے لئے ہم سب بیچین ہیں"

"آپ سے زیادہ آپ کے حالات جاننے کے لئے میں بیچین ہوں سمیدجی میری کہانی بہت لمبی نہیں ہے۔ اس غار میں آنے سے پہلے میں صوبہ بہار کے نالندہ مقام پر رہتا تھا۔ اس زمانہ میں وہاں ایک کالج تھا جس میں میں پہلے پڑھتا پڑھاتا تھا۔"

اوہو آپ نالندہ کالج کے پروفیسر وشو بندھو ہیں۔ واقعی ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ آپ کے درشن نصیب ہوئے۔ میں بھی تین سال سے بیس سال کی عمر تک آپ ہی کے کالج کی گود میں پلا ہوں وہاں کے "وشو بندھو بورڈنگ" میں میں نے آپ کا مجسمہ دیکھا ہے۔

"تو ہمارا پیارا کالج ابتک موجود ہے۔

"موجود ہی نہیں بلکہ آج اس کے مقابلہ میں دنیا میں شاید ہی کوئی تعلیم گاہ ہو فلسفہ علم نجوم، سائنس، لسانیات، تاریخ اور سیاست کی تعلیم کے لئے نالندہ مشہور ہے۔"

جس وقت میں نالندہ کالج کی تعریف سن رہا تھا۔ اس وقت میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی، دل میں خوشی کی لہریں موجیں مار رہی تھیں۔ حاضرین بھی اس تعارف سے بہت مسرور معلوم ہو رہے تھے۔ سب کے سب میری طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جن سے محبت اور مہربانی کے جذبات چھلکے پڑتے تھے۔ اب مجھ پر گذری ہوئی باتیں انھیں معلوم ہی ہو چکی تھیں میں نے انکے حالات جاننے کے لئے اپنی رام کہانی کو یوں جلدی سے ختم کر دیا۔

"کوئی تیس سال تک کالج کی خدمت کرنے کے بعد میں شمال کی طرف سیر کرنے آیا۔ اس گپھا میں جو بارہ تیرہ کوس پر ہے پہنچ کر مجھ پر عالم غشی یا نیند طاری ہوگئی اور اب تک وہیں پڑا رہا۔ بس یہی میری پوری کہانی ہے۔ اب آپ لوگ بتائیے کہ آپ کا وطن کہاں ہے۔ آپ کی زبان تو نیپالی نہیں معلوم ہوتی"

"اب اس نیپالی زبان کو تو آپ کہیں بھی رائج نہ پائینگے ہاں کتب خانوں میں اس زبان کی کتابیں ضرور پائیں گے۔ اب سارے ہندوستان میں ایک ہی زبان بولی جاتی ہے۔ ہم سب کا جنم ایک ہی جگہ نہیں ہوا ہے۔ میرے والد کی پیدائش کاٹھ مانڈو میں ہوئی تھی لیکن نالندہ کالج میں تکمیل تعلیم کے بعد انھوں نے گیا ضلع کے شاک گاؤں کو اپنے کام کا مرکز بنایا۔ میری پیدائش وہیں کی ہے۔ میرے والد زندہ ہیں اور آج کل والدہ کے ساتھ ہزاری باغ کے ورد گاؤں میں رہتے ہیں۔ ان کی عمر سو سال سے اوپر ہوگئی ہے اسی طرح یہاں کے ہمارے سب ساتھیوں کے بارے میں سمجھئے۔ میری ساتھی ممتا (کی قریب ہی بیٹھی ہوئی نوجوان لڑکی کی طرف اشارہ کرکے) پیدائش کاشی کی ہے۔ لیکن ان کی تعلیم بھی نالندہ کالج ہی میں ہوئی ہے۔ شادی کے بعد ہم دونوں نے یہیں کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ارجن کی پیدائش لنکا کے ایک گاؤں انورادھ پور کی ہے۔ لیکن جب یہ ایک ہی سال کے تھے تو ان کے والدین بودھ گیا میں آئے اور انھوں نے بھی نالندہ ہی میں تعلیم پائی۔ ان کی ساتھی پرتبھا کشمیر کی ہیں۔ لیکن تعلیم ان کی اُسی کالج میں ہوئی ہے۔ اسی طرح ہمارے یہاں پر جتنے ساتھی موجود ہیں ان کی تعداد سو ہے اور ان کا مقام پیدائش ایک سو سے کچھ ہی کم ہونگے۔ ہمارے سب گاؤں میں پانچ ہزار کی آبادی ہے جس میں آدھے مرد و عورت دوسرے جگہوں کے ہیں۔ بات یہ ہے کہ تین سال کی عمر میں ہی لڑکے تعلیم کے لئے اسکول بھیج دیئے جاتے ہیں اور بیس سال کی عمر میں تعلیم ختم ہونے پر ان میں سے بہت کم اپنے مقام پیدائش پر لوٹتے ہیں جس کا جس علم اور ہنر کی طرف رجحان ہوا دہ

اسی طرح کے گاؤں میں جا بستا ہے۔

"تو معلوم ہوتا ہے کہ اب تمام باتوں میں پرانے زمانہ سے فرق ہو گیا ہے، اچھا یہ تو بتاؤ اس وقت نیپال کا راجہ کون ہے؟"

"نیپال کا راجہ! راجہ کا لفظ اب صرف کتابوں کی زینت ہے۔ اب راجہ کہاں!"

"اچھا! تو یہ باغات کس کے ہیں؟"

"اب تو تمام چیزیں پوری قوم کی ہیں۔ صرف باغ کیا۔ یہ گھر، کرسی، پلنگ، لڑکے، مرد و عورت سب ملک کے ہیں۔"

"تو قوم کا بندوبست کیسے ہوتا ہے؟"

"ہمیں لوگوں کی چنی ہوئی پنچایتوں سے گاؤں، ضلع، صوبہ، ملک، یہاں تک کہ پوری دنیا کا انتظام اسی طرح ہوتا ہے۔"

"کیا پوری دنیا ایک ہی قوم ہے؟"

"ہاں آج سو برس سے۔ اچھا تو اب ہمیں اجازت دیجئے ہم لوگ اپنا بچا ہوا کام ختم کر آئیں (گھڑی دیکھ کر) چار بج گئے۔ پانچ بجے ہم لوگ یہاں سے چلیں گے۔ میں ابھی گاؤں کے صدر کو آپ کے آنے کی اطلاع دیتا ہوں۔ شام کو وہیں قیام کرنا ہوگا۔"

"ہاں۔ آپ لوگ اپنا کام کریں۔ میں مزے میں یہاں بیٹھا ہوں۔"

سمید کے اٹھتے ہی تمام لوگوں نے باغ کا راستہ لیا۔ سمید نے ٹیلیفون کی گھنٹی بجائی۔ جس کا جواب بھی فوراً ملا۔ انھوں نے چپکے سے نہ جانے کیا کہا۔ پھر کچھ سن کر وہ مجھ سے بولے ہمارے گاؤں کے صدر دیومتر آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ میں تو اب کام پر جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ بھی کام پر چلے گئے۔ میں ریڈیو فون کے پاس گیا۔ وہاں دیکھتا ہوں کہ ایک شیشہ پر ایک آدمی کا عکس ہے۔ میں چونک کر غور سے دیکھنے لگا۔ وہ میرا عکس نہیں تھا۔ پاس کوئی دوسرا آدمی بھی نہ تھا۔ پھر یہ کوئی تصویر بھی نہیں تھی۔ میں پریشان ہو رہا تھا کہ

اتنے میں اس عکس کے ہونٹ ہلے اور ٹیلیفون سے آواز آئی۔ "خوش آمدید" میں دیوتر ہوں
ابھی ساتھی ٹمید نے آپ کی تشریف آوری کی اطلاع کی تھی۔ سب سے بڑا کام تو یہ ہے کہ ابھی
آپ کی تصویر اور حالات کو پٹنہ بھیج رہا ہوں۔ وہاں سے چھ بجے کے اندر ہی اندر ساری
دنیا میں آپ کی تصویر اور حالات پہنچ جائینگے۔ آپ کے یہاں آنے پر میں خیر مقدم کیلئے
حاضر رہونگا۔ اس وقت آپ کو زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ آپ تھکے ماندے ہونگے
آرام کریں۔

میں نے "دیوتر" کی باتوں کو اگرچہ تعجب سے سنا لیکن دل میں یہ سوچ کر اطمینان
کر لیا کہ یہ سب سائنس کے کارنامے ہیں۔ بہت دنوں کے بعد چلنے سے بیچ بیچ پاؤں میں تھکاوٹ
محسوس ہونے لگی تھی لیکن نیند غائب تھی۔ ابھی لیٹنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ
آدھے کھلے دروازے سے دوسرے کمرے میں جھانکا۔ ایک الماری میں اور اس کے پاس
پڑی ہوئی میز پر کتابیں رکھی تھیں۔ میری حیرت نے مجھے پلنگ کی طرف قدم بڑھانے سے
روک کر اس طرف متوجہ کر دیا۔ دیکھتا ہوں کہ الماری میں خوبصورت مجلّد کتابیں رکھی ہیں،
پاس کی ایک کرسی پر بیٹھ کر میں میز پر سے ایک کتاب اٹھا کر دیکھنے لگا۔ کتاب میں معمول سے
زیادہ وزن معلوم ہوا کھول کر دیکھا تو چاندی کے رنگ کے کسی دھات کے اوراق ہیں۔
لکھائی، چھپائی بے حد خوبصورت تھی۔ دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ دیکھوں کہاں کی چھپی
ہے۔ معلوم ہوا کہ نالندہ پریس میں ۲۰۴۲ء میں چھپی ہے۔ سو سال ہو گئے لیکن معلوم ہوتی
ہے کہ ابھی پریس سے آئی ہے۔ کھولنے پر اس کے اوراق بہت باریک نظر آئے۔ ایک
انچ میں کوئی تین ہزار اوراق رہے ہونگے۔ مجھے قدم قدم پر موجودہ دور کے حالات
حیران کر رہے تھے۔ میں نے سوچا پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ یہاں کون کون سی کتابیں ہیں۔
میز پر کچھ موٹے حروف میں فہرست کتب کی ایک چھوٹی سی جلد دیکھی۔ دیکھنے سے
معلوم ہوا تاریخ علم نباتات ادب اور جغرافیہ سے تعلق رکھنے والی یہاں دو سو کتابیں ہیں

ان کتابوں میں بیشتر کتابیں ہندی کی تھیں۔ کچھ کتابیں عالمگیر زبان میں بھی تھیں اور ایک دو انگریزی کی بھی۔ میں نے جس کتاب کو اس وقت کے لئے سب سے مناسب سمجھا وہ تھی "عالمگیر بین الاقوامی تنظیم کی تاریخ" اسے لیکر میں کرسی پر جا بیٹھا۔ کتاب کی چھپائی وغیرہ بہت خوب تھی۔ چھپی بھی اسی سال کی تھی۔ مصنف نالندہ ودیالہ کے ایک تاریخ کے پروفیسر تھے۔ میں نے سوچا دو ڈھائی ہزار صفحوں کی اس کتاب کا ایک گھنٹہ میں پڑھنا مشکل ہے۔ لہٰذا اس کے فہرست ابواب ہی دیکھ لوں۔

فہرست ابواب دیکھنے سے ۱۹۲۴ء کے بعد کی موٹی موٹی باتیں جو معلوم ہوئیں وہ یہ تھیں۔ برطانوی سلطنت سے ہندوستان کو آزادی ۱۹۵۰ء میں مل گئی۔ کل ایشیا کی جمہوریت ۱۹۶۰ء میں۔ کل ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا کی جمہوریت ۲۰۰۰ء میں کل یورپ امریکہ کی جمہوریت ۲۰۵۱ء میں، عالمگیر جمہوریت ۲۰۲۴ء میں تکمیل کو پہنچی۔ میں نے کہا دیکھوں آج کل عالمگیر قومیت کا صدر کون ہے۔ میں نے اس کے لئے کتاب کا آخری باب دیکھا جس میں ناموں کے ساتھ ان اشخاص کی تصویریں تھیں اور جائے پیدائش اور جائے تعلیم بھی درج تھی۔ پوری دنیا کے صدر اگلے تین سالوں کے لئے علامہ رزمی چنے گئے ہیں جن کی جائے پیدائش ہندوستان کی ہے۔ تعلیم انھوں نے ٹکشیلا میں پائی۔ عمر چوہتر سال کی ہے۔ وزیر اعظم اوہارا ایک جاپانی ہیں۔ وزیر تعلیم موبولن نام کی ایک روسی خاتون ہیں۔ وزیر صحت ڈیوڈ امریکہ کے باشندہ ہیں۔ اسی طرح دوسرے دوسرے شعبوں کے وزراء مختلف ملکوں کے لوگ ہیں۔ میں نے خوب غور کرکے دیکھا لیکن وزیر جنگ نظر نہیں آیا۔ خیال میں آیا چھپائی کی غلطی سے شاید نام چھوٹ گیا ہے۔ بھلا ایسا اہم شعبہ خالی کیسے رہ سکتا ہے۔ بعد میں میں نے ملک کی قومی مجلس کی فہرست پر نظر ڈالی وہاں بھی وزیر جنگ کا نام غائب تھا۔ میں نے آخر کی فہرست الفاظ پر نظر ڈالی جہاں فوج اور سپہ سالار، وزیر جنگ وغیرہ الفاظ آتے تھے۔ ان کے پڑھنے سے معلوم

ہوا کہ سنہ ۲۰۲۱ء ہی میں پرانی دنیا کا یہ اہم عہدہ اُٹھا دیا گیا۔ اب نہ تو فوج کا ہی وجود ہے اور نہ سپہ سالار کا۔

میں ابھی اتنا ہی دیکھ پایا تھا کہ اتنے میں تمام لوگ کام سے واپس آگئے آتے ہی حمید نے مجھے چلنے کے لئے کہا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ مکان سے باہر جانے پر صرف دروازہ بند کر کے جب تمام لوگوں کو جاتے دیکھا تو پوچھا "کیا یہاں کوئی نہیں رہے گا"؟

"ضرورت ہی کیا ہے؟"

"چیزوں کی رکھوالی کے لئے اور نہیں تو مکان میں تالا ہی لگا دیجئے" "ایسا نہ ہو کہ کوئی انجان آدمی غلطی سے کوئی پرزہ چھو کر اپنی جان دیدے

صرف بجلی کے کارخانوں میں تالا لگاتے ہیں۔ یہاں کتابوں کے چھونے سے کون مر جائیگا۔ باقی رہا یہ سوال کوئی جانور اندر جا کر سامان خراب نہ کر دے تو اس کے لئے دروازے موجود ہیں"

جانور کا نام آتے ہی خیال آگیا کہ یہاں تو پہلے بہت بندر تھے۔ پوچھا۔

"اچھا یہ تو معلوم ہو گیا کہ اب چوری کا اندیشہ نہیں ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ۔ پہلے یہاں بہت سے بندر تھے اب وہ کیا ہوئے؟ ایک بھی نہیں نظر آتا"

"آپ یہ سو سال پہلے کی بات پوچھ رہے ہیں۔ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ پہلے جن جن جگہوں پر بندر بہت تھے فصل کا نقصان ہوتا دیکھ کر سرکار نے بڑی محنت سے اُنکو پکڑ پکڑ کے بندریوں کو ہزاروں پنجروں والے گھروں میں بند کر دیا اور بندروں کو ایک جزیرہ میں چھوڑ دیا۔ اسطرح بیس پچیس سال کے اندر ہی اندر انکی نسل ختم ہو گئی۔

"تو کیا اب دنیا میں ایک بھی بندر نہیں رہ گیا ہے؟"

"کچھ ہیں جو علم الحیوانات کی ترقی کے لئے بڑی بڑی تجربہ گاہوں میں رکھے گئے ہیں جہاں اُن کی تعداد ضرورت کے مطابق بڑھائی جاتی ہے۔ بندر ہی نہیں اور بھی ایسے مختلف جانور ہیں جو اب صرف تجربہ گاہوں کی زینت ہیں۔ جنکو پہلے لوگ بڑی خواہش سے پالتے تھے میں نے

ہمت کر کے پوچھا۔ کتے، بلّی تو گاؤں میں ہیں نا؟

"نہیں ان سے گاؤں کو فائدہ ہی کیا ہے۔ ان کی نسل بھی اب صرف آپ تجربہ گاہوں میں پائینگے۔" موٹریں سڑک پر کھڑی نظر آئیں۔ ہم نے گفتگو کرتے ہوئے اپنی اپنی جگہوں کا انتخاب کیا۔ ایک ایک موٹر میں بیس بیس آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ میں نے پوچھا "توڑے ہوئے پھل کہاں گئے؟"

وہ تو اسی وقت توڑے جاتے تھے اور موٹروں پر لاد کر بھیج دیئے جاتے تھے۔ آپ کے آنے کے وقت معلوم ہوتا ہے، موٹریں بوجھ لے کر چلی گئی تھیں یہاں دیر تک رکھ کر سکھا دینے سے تو پھلوں کو نقصان ہوتا۔ اسلئے اسٹیشن پر جاتے ہی انھیں برف کی گاڑی میں رکھ کر ضرورت کے مقامات پر بھیج بھی دیا گیا ہوگا۔"

"تو آپ کے گاؤں میں صرف پھل ہی پیدا ہوتے ہیں۔"

"ہاں صرف پھل۔ اس میں صرف سیب کے باغ زیادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے گاؤں کا نام ہی سیب گاؤں پڑ گیا ہے۔ ہمارے یہاں سے پندرہ میل پر نارنگی نگر ہے۔ جہاں صرف نارنگی کے باغات ہیں۔ آپ نے پیچھے باگ متی کے اس پار کیلوں کا جنگل دیکھا ہوگا۔"

"ہاں دیکھا تھا"

"وہ کیلا گاؤں" کی حد میں ہے جہاں کیلے ہی کیلے پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں ایک چھوٹا سا نارنگی کا بھی باغ ہے۔ آپ نے ناشتہ میں جو کیلا کھایا تھا وہ وہیں کا تھا۔"

"میں نے سب پھلوں کا ذائقہ بے حد اچھا اور شیریں پایا۔ وہ معمول سے بڑے بڑے بھی تھے۔ کیا اس میں بھی کوئی بات ہے۔"

"ہاں اب علم نباتات آپ کے زمانہ سے بہت ترقی کر گیا ہے۔ پھلوں کی عجیب عجیب شکل، رس اور خوشبو پیدا کرنا انسان کے ہاتھ میں ہے۔"

ہماری گفتگو جاری تھی۔ موٹریں فراٹے کے ساتھ —— بھاگتی جارہی تھیں دونوں طرف

سڑک کے کنارے سیبوں کے باغیچے تھے۔ ہماری سڑک اگرچہ کہیں کہیں دس بیس ہاتھ ڈھلوان میں چلی جاتی تھی لیکن نشیب و فراز اتنا مختصر تھا کہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا۔ دائیں طرف باگ متی اور بائیں طرف پہاڑ۔ باگ متی کہیں کہیں پر چار سو گز نیچے چلی گئی تھی۔ کہیں اس سے کم۔ باغات کنارے کنارے پھیلے ہوئے چلے گئے تھے۔ زمین ہموار کر دی گئی تھی۔ چٹانیں جو زمین کو ناہموار بناتی تھیں وہ یا تو ڈھانک دی گئی تھیں۔ یا توڑ کر گنگا میں پھینک دی گئی تھیں۔ مجھے انسان کی طاقت کا اندازہ کر کے حیرت اور خوشی ہوئی۔

سوچتے سوچتے مرے دل میں آیا۔ سیب اور نارنگی کی فصل ہمیشہ تو نہیں ہوتی۔ اور دنوں میں یہ لوگ کیا کام کرتے ہوں گے۔ جواب پانے سے پہلے ہی آس پاس کے باغوں میں چھوٹے چھوٹے پھل دکھائی پڑے۔ میں نے پوچھا "یہ کیا کسی دوسری نسل کے سیب ہیں جو اتنے چھوٹے ہیں" "نسل میں فرق تو ضرور ہے لیکن قد میں نہیں یہ بڑھکر ان سے بھی بڑے اور سرخ ہوتے ہیں۔ ان کی فصل ابھی دو ماہ میں تیار ہو گی۔ ہمارے یہاں فصل برابر لگتی اور کٹتی رہتی ہے۔

ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ موٹریں ریل کی سڑک پار کر گئیں۔ میں نے پوچھا یہ ریل کہاں جاتی ہے؟"

یہ چندر اگڑھی ہوتی ہوئی کاٹھمانڈو اور وہاں سے آگے بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔ کیا ریل ان پہاڑوں پر چلی گئی ہے۔ میں نے تو اس وقت چندر گڑھی پر بوجھ ڈھونے کے لئے رستہ کے پل کا انتظام دیکھا تھا۔ اس زمانہ میں اس کے لئے "بھمرپنگ" کے بجلی گھر کی طرف سے بجلی کے کھمبے گڑے گئے تھے"

"اب تو "بھمرپنگ" میں ویسا کوئی بجلی کا کارخانہ نہیں ہے۔ میں نے بھی پڑھا ہے پہلے نیپال میں چندر شمشیر نام کا ایک راجہ تھا۔ اس نے اپنے ملک کو نفع پہنچانے ہی کے لئے وہاں ایک بجلی کا کارخانہ بنوایا تھا۔ لیکن آج ڈیڑھ سو سال سے بھی اوپر ہوئے وہ

بند کردیا گیا۔"

"کیوں بند کردیا گیا؟"

"وہاں آس پاس کے پہاڑی آبشاروں کا پانی ایک تالاب میں جمع کرکے اس سے بجلی پیدا کی جاتی تھی۔ حالانکہ اس سے محض تھوڑی سی بجلی پیدا ہوتی تھی۔ جو شاید اس وقت کے خرچ کے لئے کافی سمجھی جاتی ہو۔ لیکن جھرنوں کے پانی کا اس طرح استعمال کرنے سے فرنگ کے آس پاس کے پہاڑوں کے درخت اور پودے سوکھتے جا رہے تھے۔ چاہے چندر نے اپنے ہی خیال سے ان دونوں کا ۔ب کو کیوں نہ شروع کیا ہو۔"

"دوسرا کام کون سا؟"

"دوسرا کام پہاڑوں اور آس پاس کے جنگلوں کو کاٹ کر کھیت بنوانا تھا"

"اس سے نقصان کیا تھا؟"

"اس سے بھی پہاڑ آہستہ آہستہ سوکھے جا رہے تھے۔ بارش کم ہونے لگی آخر پچاس سال کے اندر ہی اندر پانی کی کمی سے ان کھیتوں کو چھوڑ کر لوگوں کو بھاگ جانا پڑا۔

"تو کیا اس کارخانہ کو بند کرنے سے فائدہ پہنچا؟"

"ہاں بہت اگر آپ اب جا کر دیکھیں تو فرنگ کے آس پاس کے پہاڑ باغیچوں سے ہرے بھرے ملیں گے۔ چاروں طرف سیب، ناشپاتی، انگور اور انار کے دانے لہلہاتے پائیں گے۔ یہ سب پھل وہاں ہوتے بھی ہیں۔ بڑے بڑے اور میٹھے۔ اس طرح باغیچوں کا جنگل لگ جانے سے پہلے سے اب کئی گنا زیادہ فائدہ ہے۔ پہاڑ اب پھر تر ہو گئے ہیں جھرنے بھی اب بہت ہیں۔

"تب تو ہر جگہ بھاری انقلاب ہو گیا ہے۔ اچھا اب شاید آپ کا گاؤں بھی قریب ہے۔ وہی مکان تو دکھائی دے رہے ہیں۔"

"ہاں وہی لیکن گاؤں ابھی تین میل دور ہے۔ یہی دس منٹ کا راستہ"

"کیا آپ نے نیپال کی سیر کی ہے؟"

"ہاں بہت"

"میری سالانہ چھٹی زیادہ تر تبت ہی کی سیر میں کٹی ہے۔ مجھے تیس سال یہاں رہتے ہو گئے۔ ہر سال دو مہینہ کی سالانہ فرصت ملتی ہے۔ میں نے دس بارہ چھٹیاں وہیں کی سیر میں گزاری ہیں۔ جغرافیائی اور اقتصادی نکتہ نظر سے بھی میں نے وہاں کے حالات پر بہت غور کیا ہے۔"

اس شخص سے اس قسم کی باتیں سن کر مجھے اور بھی تعجب ہوتا تھا۔ بیسویں صدی میں ایسا انسان کسی اچھے کالج کا پروفیسر ہوتا۔ لیکن آج یہ معمولی آدمیوں میں ہے۔ کیا علم کی قدر کم ہو گئی ہے یا علمیت کا معیار بلند ہو گیا ہے۔ میں نے پوچھا "آپ کی اس علمی لیاقت سے اوروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے؟"

"کیوں نہیں۔ ہمیں ڈیوٹی تو تین ہی گھنٹے کرنی پڑتی ہے۔ باقی وقت میں کرتے ہی کیا ہیں۔ میں نے کئی بار اپنے پسندیدہ موضوع پر یہاں تقریر کی ہے چھٹیوں میں دوسرے ملکوں میں بھی تقریریں کر آیا ہوں۔ ماہانہ رسالوں میں بھی مضامین شائع کراتا ہوں"

"اچھا یہ تو ہوا۔ بھلا یہ تو بتاؤ، نیپال کیا کیا چیزیں پیدا کرتا ہے۔"

"معدنیات میں یہاں تانبا، لوہا اور سیسہ اور اپنے یہاں کا کام چلانے کے لئے کوئلہ بھی کانی نکل آتا ہے لیکن اب بجلی کا استعمال زیادہ ہونے سے کوئلے کی زیادہ ضرورت نہیں رہی۔ اس کے علاوہ ملک اور کوشل تک یہاں سے بجلی جاتی ہے اور یہ بجلی تیار ہوتی ہے ندیوں کے پانی کی طاقت سے یہ ریل بھی اسی بجلی سے چلائی جاتی ہے۔ پھر اس سے ہماری موٹریں بھی چل رہی ہیں۔ اس کے علاوہ نیپال میووں کی کان ہے۔ کروڑوں بھیڑیں اور بہت سے کمبلوں کے کارخانے بھی یہاں ہیں۔ آدھے

سے زیادہ ہندوستان کے گرم کپڑے نیپال ہی میں تیار ہوتے ہیں"

"تو معلوم ہوتا ہے یہاں چاول اور گیہوں نہیں ہوتا"

"نہیں یہ چیزیں دوسرے صوبوں سے آتی ہیں۔ آج کل جو چیز یہاں اچھی پیدا ہو سکتی ہے وہ وہیں پیدا کی جاتی ہے۔ ایک گاؤں ایک ہی چیز پیدا کرتا ہے۔ وہاں کی ضرورت کی دوسری چیزیں دوسری جگہوں سے پہنچتی ہیں"

"ہم گاؤں کے پہلے مکان کے پاس پہنچ رہے تھے۔ وہی آدمی جس کے عکس کو میں نے ٹیلیفون میں دیکھا تھا میرے خیر مقدم کے لئے کچھ اور آدمیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ تمام مرد و عورت خوبصورت اور صاف ستھرے نظر آرہے تھے۔ سڑک کے کنارے خوبصورت مکانوں کی قطاریں تھیں۔ تمام مکان یک منزلہ اور ایک ہی قسم کے تھے۔ مجھے یہ ایک بالکل نئی دنیا معلوم ہوئی۔ ابھی میں ان باتوں پر غور ہی کر رہا تھا کہ دیومتر نے کہا "اس راستہ سے آئیے"

میں پیچھے ہو لیا۔ میرے ساتھ وہ تمام لوگ آرہے تھے۔ اب ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ جس مکان کی طرف ہم جا رہے تھے۔ اس پر موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا۔

"مہمان خانہ"

گاؤں کے صدر نے پہنچتے ہی وہاں پر موجود ایک آدمی سے پوچھا "ساتھی کون سا کمرہ آج کے مہمان کے قیام کے لئے ٹھیک ہوا ہے؟"

اس نے کہا "پانچواں کمرہ"

"ابھی کمرہ کے دروازہ ہی پر پہنچے تھے کہ بغل والے کمرہ سے ایک دوسرا شخص نمودار ہوا جس کی عمر ستر اور اسی کے درمیان ہوگی۔ اس نے بھی میرا خیر مقدم کیا۔ ہم سب کمرہ میں داخل ہوئے۔

صدر نے کہا "اس وقت ہم لوگ آپ کو زیادہ تکلیف نہیں دینگے۔ آپ سفر کے

تھکے ماندے ہیں۔ تھوڑی دیر آرام کریں۔ آٹھ بجے کھانا کھانے کے بعد آپ کے درشن کے خواہشمند تمام گاؤں والے کامن روم میں جمع ہوں گے۔ مجھے تو آپ جانتے ہیں۔ میں آجکل اس گاؤں کا صدر ہوں۔ یہ دوسرے بیس ساتھی اور دو عورتیں گاؤں کی مجلس کے ارکان ہیں۔ یہ وشوامتر ہیں نالندہ کالج میں تاریخ کے پروفیسر تاریخی تحقیق و تفتیش کے سلسلہ میں تبت گئے تھے جہاں سے آج ہی ہوائی جہاز سے آئے ہیں۔ بعد میں آپ کو ان سے اور باتوں کا علم ہوگا اور یہ ہمارے گاؤں کے بقیہ ساتھی ہیں۔"

تھوڑی دیر میں اور لوگ مجھ سے اجازت مانگ کر چلے گئے۔ دیو نے بجلی کی روشنی کردی کیونکہ سورج غروب ہو چکا تھا۔ پہاڑی سردی بھینی بھینی معلوم ہو رہی تھی راستہ میں سُمید نے مجھے ایک اونی لبادہ پہنادیا تھا لیکن وہ کافی نہیں تھا۔ دیو نے بجلی کی انگیٹھی روشن کردی اور تھوڑی دیر میں کمرہ گرم ہو گیا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور وشوامتر سے بھی کہا کہ اگر کوئی ضروری کام نہ ہو تو بیٹھ جائیے وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گئے۔ باغ میں جو تاریخی کتاب دیکھی تھی اُس کے مصنف کے نام سے اگرچہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ وہی وشوامتر ہیں تاہم میں نے پوچھا "عالمگیر بین الاقوامی انجمن کی تاریخ" کے مصنف پروفیسر وشوامتر آپ ہی ہیں" اُنھوں نے عاجزی کے ساتھ جواب دیا "ہاں میں ہی ہوں"

"مجھے آپ کی ملاقات سے بڑی مسرت حاصل ہوئی۔"

"نالندہ کے لوگ آپ کو ہمیشہ یاد کرتے ہیں آپ نے جو بیج وہاں ڈالے تھے انکو تناور درخت کی شکل میں دیکھ کر آج آپ خوش ہوں گے۔ آپ اور گاؤں کے صدر کی گفتگو کے بعد ہی آپ کے آنے کی اطلاع مجھے مل گئی تھی۔ وہاں سارے کالج کے لوگ آپ سے ملنے کے خواہشمند ہیں ہمارے "پرنسپل یوسف" نے مجھ سے کہا ہے کہ سب سے پہلے آپ کے دیدار کے حقدار نالندہ کے لوگ ہیں۔

"آپ نے کیا ٹیلیفون کے ذریعہ سے یہ خبر معلوم کی؟"

"وہاں ابھی ابھی تو کتب خانے میں ٹیلیفون پر بات ہی کر رہا تھا۔ آپ کے یہاں پر آنے کی اطلاع بھی میں نے کر دی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ اگر تکلیف نہ ہو تو اسی وقت بات چیت اور ملاقات کے لئے فون پر آ جائیں" "نہیں مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ کون پیدل آیا ہوں" "یہ میرے لئے بھی کم خوشی کی بات نہیں ہے" ہم دونوں اُٹھ کر کتب خانہ میں گئے یہ سو ڈیڑھ سو آدمیوں کے بیٹھنے کے لائق ایک کھلا ہال تھا۔ دو الماریاں کتابوں کی رکھی تھیں۔ بجلی روشن تھی۔ درمیان میں بڑی بڑی میزیں اور بیٹھنے کے لئے بہت سی کرسیاں پڑی تھیں وشوامتر نے جا کر ٹیلیفون کی گھنٹی بجائی میں وہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ لمحوں کے بعد بولے ہمارے پرنسپل آپ کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ میں نے جا کر دیکھا۔ شیشے میں ایک بزرگ شخص کا عکس ہے۔ عکس نے ہونٹ ہلا کر سر جھکایا اور ٹیلیفون سے آواز آئی خوش آمدید"۔ میں نے بھی سر جھکا کر "خوش آمدید" کہا۔

"وشوامتر نے کہا۔ "یہی ہمارے پرنسپل ہیں۔ آپ ستّر سال سے کالج کی خدمت کر رہے ہیں اور بیس سال سے آپ آچاریہ کے عہدے پر فائز ہیں۔

میں نے کہا "یوسف صاحب آپ سے ملاقات کر کے مجھے بڑی مسرت ہوئی حقیقت میں آپ سب قابل مبارکباد ہیں کہ اس طرح متواتر درس و تدریس کے ذریعہ دنیا کو ترقی دے رہے ہیں"

"یہ تو ہمارا فرض ہے۔ ہاں نالندہ کالج کی طرف سے میری درخواست ہے کہ اور کسی جگہ کی دعوت قبول کرنے سے پہلے آپ اپنے کالج میں تشریف لائیں"

"یہ خود میری بھی خواہش ہے۔ اس کے بارے میں اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہاں سے سیدھا وہاں ہی آؤنگا"

"پروفیسر وشوامتر آپ کی خدمت میں موجود ہیں یہ بھی خوشی کی بات ہے۔ وہ اب کالج کو واپس آ رہے ہیں انھیں کے ساتھ تشریف لائیے۔ آپ کا جسم بہت لاغر اور ناتواں

ہے اس لئے ہماری یہ خواہش نہیں کہ آپ بہت جلد آنے کی کوشش کریں۔"

"میں یقیناً یہاں سے وہیں آرہا ہوں، تمام طلبار اور طالبات اور تمام معلّم و معلّمہ تک میری بہترین خواہشات پہنچادیں"

"یہاں آپ کی باتیں ہم سب سن رہے ہیں۔ اچھا تو اب آرام کریں۔"

اس مختصر سی گفتگو نے میرے دل میں بیحد مسرّت پیدا کردی۔ میں وشوامتر کا ہاتھ پکڑے وہاں سے اپنے کمرہ میں آیا۔ میں نے کہا "وشوامتر میرے زمانہ اور اب کی دنیا میں بڑا فرق ہے۔ تم تو تاریخ کے پروفیسر ہو۔ ان باتوں کو جانتے ہو۔ لیکن مجھے یہ سب کچھ زیادہ حیرت انگیز اسلئے معلوم ہوتا ہے کہ میں نے دو سو سال پہلے کی دنیا انھیں آنکھوں سے دیکھی تھی۔ مجھے وہ باتیں کل کی سی معلوم ہوتی ہیں۔ اس زمانہ میں اخوت اور برابری کی دھیمی سی آواز اٹھی تھی لیکن یہ تصویر خواب میں بھی نہیں نظر آتی تھی۔ میں آج ہی تمھاری دنیا میں آیا ہوں۔ ابھی تو میں اس کا تھوڑا سا بھی حصّہ دیکھ اور سمجھ نہیں پایا ہوں۔ لیکن اتنے ہی میں بحرِ حیرت میں غرق ہوں۔ یہ دیکھ کر مجھے مسرّت ہورہی ہے کہ تمھاری دنیا نے امید کے مطابق ترقی کی ہے۔"

# بابِ چہارم

## نالندہ یونیورسٹی

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ نالندہ کالج کی اس وقت کیا حالت ہے؟"

"اب نالندہ بڑا عالیشان کالج ہے۔ پُرانے بڑگاؤں سے راجگیر تک ودیالہ کی عمارتوں اور ہوسٹلوں کا سلسلہ ہے۔ ساری دنیا میں تاریخ اور فلسفہ کے لیے ایسا دوسرا کالج نہیں۔ وہاں تعلیم حاصل کرنے یورپ، امریکہ، جاپان، افریقہ، آسٹریلیا تمام جگہوں سے طالبعلم آتے ہیں، آثار الصنادید کا دنیا میں سب سے بڑا میوزیم یہیں ہے۔ قدیم رسم الخطوں اور زبانوں کے پڑھنے پڑھانے کا یہاں بہترین انتظام ہے۔ بین الاقوامی انجمن کی اجازت سے یہاں صرف ہندوستان ہی کے تاریخی صنادید نہیں موجود ہیں بلکہ روم و مصر، یونان، اسیریا، میکسکو وغیرہ کے بھی۔ نالندہ کو فخر ہے کہ اس نے دیگر ممالک سے متعلق تاریخی تحقیق و تفتیش میں بھی بڑی مدد کی ہے۔ فلسفہ کی تعلیم کا نالندہ میں بہترین معیار ہے۔ قدیم و جدید مشرقی اور مغربی ہر دور کے فلسفہ کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ہمارے پرنسپل فلسفہ کے بہت بڑے عالم ہیں۔ سنسکرت، پالی، جنددھ، پراکرت، یونانی، لاطینی، وغیرہ بہت سی زبانوں کے وہاں پروفیسر ہیں۔ زبانوں کے سیکھنے کے طریقہ میں اب واقعی بہت بڑا انقلاب ہوگیا ہے۔ مختلف زبانوں کی تعلیم کے مناسب حال یہاں ماحول بنا ہوا ہے۔ خاص خاص زبانوں کے طالبعلموں کو یہاں رکھکر ایک طرح سے دوسری زبانوں سے انکا قطع تعلق کرا دیا جاتا ہے ان کے تمام کاروبار اُسی زبان میں ہوتے ہیں۔ چیزوں کے نام وغیرہ پروفیسر اس قسم کی چیزیں دکھلا کر اُسی زبان میں بتاتے ہیں اسطرح تین سال میں اُس زبان میں مہارت حاصل ہو جاتی ہے۔ علم نجوم کا معیار بھی ہندوستان

میں سب سے بلند نالندہ ہی میں ہے۔ راجگیر کی پہاڑی پر یہاں کی سب سے بڑی تجربہ گاہ ہے۔ علم نجوم کی ترقی میں بھی ہمارے کالج نے کافی حصّہ لیا ہے۔ ہندوستان کے نالندہ اور ٹکشیلا تک کے کالج دنیا کی مخصوص تعلیم گاہوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ٹکشیلا میں طب، علم نباتات اور علم الحیوانات وغیرہ سے متعلق بڑی تحقیق و تفتیش کی گئی ہے۔

"کالج میں پڑھنے کا وقت کیا ہے؟ تعلیم کا اصول اور طریقہ کیا ہے؟"

سترہ سال کی تعلیم ہر شخص کے لئے لازمی ہے۔ یہ قانون ہندوستان ہی کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے ملکوں کے لئے ہے تیسرے سال تک صنفِ کودکان چھ سے چودہ تک صنفِ طفلاں اور چودہ سے بیس تک صنفِ نوجوانان میں تعلیم پاتا ہے۔ عموماً یہاں پر تعلیم ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد لڑکے اپنے رجحان اور صلاحیت کے مطابق مختلف قسم کے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ لیکن جس کا رجحان علوم کی طرف دیکھا جاتا ہے اُسے اپنے خاص مضمون میں قابلیت بڑھانے کا اور بھی موقع دیا جاتا ہے چاہے وہ رجحان کسی بھی علم کی طرف ہو لیکن اس میں کوئی سختی نہیں ہے۔ اس کے بعد بھی تعلیم حاصل کرتے ہوئے انھیں آگے بڑھنے کی ہر طرح آسانیاں رہتی ہیں۔

بہت سے موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ آٹھ بج گئے۔ اسی درمیان میں مہمان خانہ کی پری پدماوتی نے آکر ہمیں خوش آمدید کہا۔ لیکن ہماری سنجیدہ گفتگو کو دیکھ کر دخل دینا مناسب نہ سمجھا اور چلی گئیں۔ اب پھر انھوں نے آکر اطلاع کی کہ آٹھ بجنے والے ہیں۔ کھانا کھانے کی توپ چھوٹنے والی ہے۔ چلنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔

# باب پنجم

## بیسویں صدی

میں نے وشوامتر سے پوچھا۔ "یہ توپیں کیوں چھوٹتی ہیں؟"

"بات یہ ہے کہ یہ آدمی کے پاس گھڑی کے ہونے کی فضولخرچی ملک نے مناسب نہیں سمجھی اس لئے وقت کی اطلاع اسی طرح کی جاتی ہے۔ دن رات میں ناشتہ اور کھانے کے لئے چار اوقات مقرر ہیں۔ سویرے، سات بجے، صبح کا ناشتہ، گیارہ بجے دوپہر کو کھانا، تین ساڑھے تین بجے ناشتہ اور پھر رات کو آٹھ بجے کھانا۔ ان چار اوقات کے علاوہ صبح کو جاگنے کے وقت توپ چھوٹتی ہے۔"

"لیکن میں نے باغ میں سُمید جی کے پاس تو گھڑی دیکھی تھی۔"

"ہاں۔ باہر کام پر جانے والوں میں ایک رہنما کے پاس گھڑی ضرور ہوتی ہے سب کے پاس نہیں۔ اچھا تو اب ہمیں چلنا چاہئے۔ یہ لیجئے توپ بھی۔ ار ار دھم۔

ہم لوگ جلد وہاں سے نکل پڑے۔ دیو، پدماوتی اور ہم دونوں۔ کل چار آدمی تھے سڑک پر چاروں طرف چاندنی کی طرح بجلی کی روشنی پھیل رہی تھی۔ سڑک صاف ستھری تھی۔ اس کے دونوں طرف ایک ہی قسم کے پختہ عمارات کی قطاریں تھیں ہر ایک مکان کے سامنے سڑک تک پھولوں کے پودے تھے جو اپنی خوشبو سے سڑک پر چلنے والوں کے دل و دماغ کو معطر کر رہے تھے۔ ہر عمارت کے سامنے ایک برآمدہ تھا جو سو سو گھروں کے لئے ایک تھا۔ وشوامتر جی نے بتایا کہ ہر ایک کے رہنے کیلئے تین تین کمرے ہوتے ہیں جن میں سے سامنے والا بیٹھک کا کمرہ اتنا ہی بڑا ہے جتنا کہ وہ کمرہ جس سے ہم ابھی نکلے ہیں۔ اس میں دس کرسیاں آسانی سے بچھائی جا سکتی ہیں۔ پیچھے کی طرف چوڑائی میں

اس سے ڈیوڑھے لیکن لمبائی میں آدھے وہ کمرے ہیں ایک خواب گاہ ہے اور دوسرا غسل خانہ یہی تینوں کمرے ملا کر ایک گھر ہوتا ہے۔ ایسے ہی سو گھروں کی ایک عمارت ہوتی ہے۔ ہر عمارت کا ایک منتظم کار ہوتا ہے جو خود بھی عمارت کے ایک مکان میں رہتا ہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ حمید اس قسم کی ایک عمارت کے منتظم کار ہیں۔ ہر ایک عمارت کا ایک مشترکہ ہال ہوتا ہے جس میں کچھ کتابیں اور تفریح کے لئے مختلف چیزیں رہتی ہیں۔ یہیں ٹیلیفون بھی رہتا ہے۔ اس سیب گاؤں میں اس قسم کی پچیس عمارتیں ہیں۔ مرد و عورت سڑک پر آپس میں باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ سب کی باتوں کا مرکز اس وقت میں ہی معلوم ہو رہا تھا۔ میں ہزاروں عورتوں اور مردوں کو سڑک پر چلتے دیکھ رہا تھا لیکن ان میں ایک بھی بچہ نہیں نظر آ رہا تھا میں نے سوچا تین سال کے بعد بچے تو لے ہی لئے جاتے ہیں شاید سردی کی وجہ سے چھوٹے بچوں کو اس وقت ساتھ نہ لائے ہوں۔ دفعتاً میں نے نزدیک کی عمارت کے سامنے موٹے حروف میں "طعام گاہ" لکھا ہوا دیکھا۔ حسین چاندنی چاروں طرف چھٹکی ہوئی تھی عمارت میں داخل ہونے کے لئے بہت سے پھاٹک بنے تھے۔ ہال میں داخل ہونے سے پہلے لوگوں نے برآمدہ میں گرم پانی کے نلوں کے پاس ہاتھ دھویا اور سامنے آویزاں رومالوں سے ہاتھ پونچھا۔ ہال میں کھانے کی میز اور کرسیاں ویسی ہی تھیں جیسی کہ باغ میں۔ ہال بہت لمبا چوڑا تھا۔ اس میں پانچ ہزار آدمی آرام سے بیٹھ کر کھانا کھا سکتے تھے۔ کمرے کی صفائی اور نفاست قابل تعریف تھی۔ باورچی خانہ شاید اسی سے ملا ہوا پیچھے کی طرف تھا۔ گاؤں کے صدر اور کچھ پہلے کے جانے پہچانے لوگ بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ مجھے ایک کرسی پر بٹھایا گیا۔ میری داہنی طرف دیومتر اور بائیں طرف شوامتر تھے۔ کھانا پہلے سے میز پر نکالا ہوا رکھا تھا۔ کھانے کی اقسام میں روٹی، گوشت اور دو قسم کی ترکاریاں تھیں۔ ایک کٹوری میں حلوا ایک طشتری میں کچھ پھلوں کی قاشیں اور ایک گلاس پانی دو منٹ کے انتظار کے بعد گھنٹہ بجنے لگا جس کے معنی تھے کہ اب کھانا شروع ہونا چاہئے۔ اتنا سا انتظام اس لئے کیا جاتا ہے کہ کھانا کھانے والے تمام لوگ آ جائیں۔ مجھے طعام گاہ کا یہ اجتماع بڑا

عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ بیچ بیچ میں مردوں کے ساتھ عورتیں بیٹھی نہایت بے تکلفی کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں؟ میں نے دل میں کہا۔ بیسویں صدی کے ہندوستانی اسکا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ حالانکہ میں نے ابھی بہت سی باتیں یہاں کے متعلق نہیں معلوم کی تھیں دیکھنے میں تعلیم و تہذیب اور رعنائی کے اعتبار سے تمام مرد و عورت اونچے طبقہ کے لوگ معلوم ہوتے تھے پھر بھی میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال اٹھتا تھا کہ یہ سب لوگ برہمن اور چھتری ہونگے یا بید۔ کچھ تو میں نے پہلے ہی سنا تھا۔ ارجن کے والدین لنکا کے باشندے تھے۔ صورت شکل سب کی ایک طرح کی تھی۔ پھر بھی بہت سے مرد و عورت یورپ والوں کی طرح گورے تھے۔ ان سب باتوں سے میرے دل میں یقین سا ہو گیا کہ یہ ایک ہی طبقہ کے لوگ ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد تمام لوگوں نے اٹھ اٹھ کر گرم نلوں پہ ہاتھ دھویا جس کے بعد ہم سب وہاں سے چل پڑے۔ گاؤں کے صدر نے پہلے ہی کہا تھا کہ ٹاؤن ہال میں تمام لوگ جمع ہوں گے۔ چنانچہ ہم لوگ اسی طرف روانہ ہوئے۔ ہاں ایک بات اور بھی دیکھی وہ یہ کہ اگرچہ ہاتھ منہ سب نے دھوئے لیکن جوتا اُتار کر کسی نے پاؤں نہیں دھویا اور نہ کپڑے کسی نے بدلے۔ ٹاؤن ہال طعام گاہ سے تھوڑی دور پہ واقع تھا۔

ٹاؤن حال کی عمارت بہت اونچی اور خوبصورت تھی۔ باہر سے بجلی کی روشنی جگمگا رہی تھی۔ موٹے موٹے روشن حروف میں سامنے کے گیٹ پر "ٹاؤن ہال" درج تھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد دیومتر نے کہا۔ جب تک تمام لوگ نہ آجائیں اُس وقت تک آپ نشست کے کمرہ میں تشریف رکھیں۔ وہاں تھوڑی ہی دیر ہوئی ہو گی کہ ہال سے گھنٹی بجی جسے سُن کر صدر نے چلنے کا تقاضا کیا۔ ہال میں پہنچتے ہی سب کی آنکھیں میری طرف لگ گئیں۔ ہال کے اندر کی آرائش و زیبائش قابل دید تھی۔ دیوار پہ مختلف قسم کی رنگین تصویریں بجلی کی روشنی میں جگمگا رہی تھیں۔ عمارت کی چھت بہت اونچی تھی اور اُس میں بڑے بڑے جھروکے لگے تھے۔ بجلی کی روشنی سے رات دن میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اگرچہ سردی پڑ رہی تھی اور جھروکے اور دریچے چوپٹ

کھلے تھے مگر برقی انگیٹھی کی گرمی سے اندر کی فضا میں سردی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ دیواروں اور چھتوں پر رنگ برنگ کے خوبصورت بیل بوٹے بنے تھے۔ مناسب جگہوں پر سلیقہ کے ساتھ دنیا کے بڑے بڑے انسانوں کی تصویریں آویزاں تھیں جن میں سیاست داں، مفکر، فلسفی ہر قسم کے لوگ تھے مثلاً گوتم بدھ، روسو، مارکس، اینجلز، سقراط، افلاطون، لینن، آئزن وغیرہ۔ درمیان میں بہت سے سوبھا شیلت آویزاں تھے۔ میں نے حاضرین کی طرف دیکھا۔ وہاں نہ کوئی گندے لباس میں تھا اور نہ کوئی لاغر تھا۔ عورت و مرد سب گدے دار بنچوں پر آرام کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کی مجموعی تعداد پانچ ہزار کے قریب ہوگی پھر بھی پیچھے کی بنچوں پر بہت سی جگہیں خالی تھیں۔ اس عمارت کا استعمال سیاسی، ادبی ہر قسم کے اجتماع کے لئے ہوتا تھا۔ گاؤں کی پنچائت بھی یہیں بیٹھتی ہے۔ باہر کے یا گاؤں کے مشہور موسیقی داں اور اداکار اپنے آرٹ سے اسی ہال میں لوگوں کو دعوت گوش و نظر دیتے ہیں۔ تاریخ اور سائنس وغیرہ پر تقریریں بھی اسی ہال میں ہوتی ہیں۔ بہت سے قومی اور سماجی تہوار یہیں پر منائے جاتے ہیں۔

لوگوں کے خاموش ہوتے ہی دیومتر نے اٹھ کر آج کی صدارت کے لئے اسمٰعیل صاحب کا نام تجویز کیا۔ تجویز پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا "اگرچہ ہم سب اسمٰعیل صاحب کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن آج کے معزز مہمان کے معلومات کے لئے اتنا کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے گاؤں کے صدر کامریڈ اسمٰعیل نیپال کی انجمن عوام کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ اگرچہ آپ ابھی صرف ساٹھ سال کے ہیں لیکن اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ہمارے درمیان بزرگ سمجھے جاتے ہیں۔ ایک اور بات ہے جو آج کے مہمان سے انکو قریب تر کر دیتی ہے یہی نہیں کہ وہ نالندہ کالج کے فرزند ہیں بلکہ ہمارے مہمان کو عالم متبحر شفیع کا نام یاد ہوگا آپ اسی دلیشال کے رہنے والے زبردست ہستی مولانا شفیع کے فرزند ہیں۔ آپ کا شمار دنیا کے بڑے بڑے سیاسی مفکرین میں ہے۔ ہمارے صوبہ کو خاص کر ہمارے اس سیب گاؤں

کو ان پر فخر ہے جن کو انھوں نے تعلیم کے ختم ہونے کے بعد ہی اپنی مستقل جائے رہائش بنا لیا ہے۔

لوگوں نے اس تجویز کو مسرت سے قبول کیا۔

اسمٰعیل صاحب بولنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ واقعی ان کے چہرہ سے ان کے بڑے ہونے کا ثبوت ملتا تھا۔ دراصل انکو ساٹھ سال کا نوجوان کہنا چاہئے۔ ساٹھ ستر سال کا اس زمانہ کا آدمی بیسویں صدی کے پینتیس چالیس کے ہٹے کٹے آدمی کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح ہر بات میں آج کی دنیا نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اسی طرح عمر اور صحت کے معاملہ میں بھی حیرت انگیز ترقیاں ہوئیں ہیں۔ اسمٰعیل صاحب نے فرمایا "اتنے لائق آدمیوں کے سامنے میرے اس خدمت کے منظور کرنے کی وجہ آپ کی بے غرض مہربانی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ میں تو ویسے ہی بڑے بڑے لوگوں کی تشریف آوری کی خبر پاکر بیحد مسرور تھا۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے علم ہی کے اعتبار سے نالندہ میں جنم نہیں لیا بلکہ میرا دراصل جنم بھی وہیں کا ہے۔ والد کے بارے میں آپ لوگوں کو معلوم ہے پورے ڈیڑھ سو سال کی عمر میں مرے تھے۔ وہ سنایا کرتے تھے کہ کیسی کیسی مشکلات اور دقتیں اٹھانے کے بعد نالندہ کالج کو نئی زندگی ملی۔ جب ان کی عمر پچیس سال کی ہوئی تو انھوں نے اپنی زندگی کالج کے لئے وقف کردی اور آخر میں وہیں انتقال بھی فرمایا۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارے ساتھ بہت سے لوگ اس وقت نالندہ کی خدمت میں مصروف تھے۔ اس وقت کالج کی زمین پر چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد تھے۔ کالج کی پرانی عمارتوں کی حالت بھتوں جیسی تھی۔ اسوقت بدھ پوکھر وغیرہ کی یہ رونق نہ تھی۔ بڑگاؤں نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں آباد تھا۔ جہاں اب بھی سورج کا مندر ہے۔ وہاں کاتک میں سورج میلہ ہوتا تھا جس میں زیادہ تر عورتیں ہی شامل ہوتی تھیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت خود غرضی کا سامراج تھا۔ لوگ عورتوں کی تعلیم میں مذہب کا نقصان سمجھتے تھے۔ ہمارے مسلمان بھائیوں نے مذہب

کے نام پر عورتوں کو جکڑ بند کر لیا جس کی دیکھا دیکھی پورے شمالی ہندوستان کی عورت ذات قید میں آ گئی۔ یہ بڑی غنیمت بات تھی کہ عورتیں کم سے کم اس میلے میں مذہب کے سلسلے میں جانے پاتی تھیں۔ یہ تو سب کو معلوم تھا کہ آچاریہ وشنو بندھو تیس سال تک کالج کی خدمت کرنے کے بعد شمال کی طرف چلے گئے اور اسوقت سے اُن کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ ہماری قسمت اس طرح جاگے گی۔ آج تین پشتیں انتظار کرتی چلی گئیں ہم سب جب ان باتوں کو سنتے تھے تو خواب سمجھتے تھے اور دل میں خواہش ہوتی تھی کہ کاش ان کا پھر درشن ہوتا۔ اگر وہ پھر سے تشریف لاتے تو ہم اُن کو سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ ہم لوگوں نے تو عورتوں پر مظالم ہوتے پیدائش ہی سے نہیں دیکھے اور نہ انسان کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہونے کا لفظ ہی سنا ہے۔ ہم نے مذہب کے نام پر کٹ مرنے کا چرچا بھی نہیں سنا البتہ تاریخ میں ہم نے ضرور پڑھا ہے۔ ہمارے ملک کی ترقی کے بانی پروفیسر وشنو متر آج یہیں ہیں۔ اور وہ یہ سب باتیں ہمیں بتائیں گے۔ تاریخ میں جب ہم لوگ مذہب کے نام پر قتل و غارت کی داستان پڑھتے ہیں تو ہمیں ہنسی آتی ہے۔ اسی طرح جس طرح ایک کیلئے ہزاروں لوگوں کا پتنگوں کی طرح آگ میں جلنے کا قصہ سن کر جن لوگوں نے اس اندھے دور کے لئے انسانی کی آزادی و بہبود کے لئے کوششیں کیں وہ قابل مبارکباد ہیں۔ آج ہمارے وشنو بندھو کی قابل مبارکباد شخصیت ہمارے درمیان موجود ہے (دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کی تصویروں کی طرف اشارہ کر کے) آج ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ تمام عظیم الشان ہستیاں جن کی یہاں تصویریں آویزاں ہیں وہ بذات خود ہمارے درمیان موجود ہیں۔ دراصل ہمارے دلی جذبات عقیدتمندوں کے ان چند لفظوں میں نہیں ظاہر کئے جا سکتے؟

ساتھیو! ہمارے گاؤں کی سب سے بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ سب سے پہلے یہیں تشریف لائے۔ آج بے انتہا خوشی کا سمندر ہمارے دلوں میں موجزن ہے۔ ہم اس مبارک ہستی کی

کس طرح تعظیم کریں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ بڑی ہستی کے لئے ہمارے پاس سوائے ان چند عقیدتمندانہ الفاظ کے اور کیا ہے کہ مہاتما! ہم سب آپ کے مشکور ہیں اور آپ کے اوصاف کی ہم سے تعریف نہیں ہو سکتی اگرچہ ہم سب خواہش مند ہیں کہ آپ کی زبان مبارک سے کچھ سنیں لیکن یہ خواہش آپ کے لئے باعث تکلیف ہوگی۔ دو سو ساٹھ سال کا قدیم جسم اور اس پر دو سو سال کا طویل روزہ اب میں زیادہ آپ لوگوں کی طرف سے مہاتما کی خدمت میں کیا عرض کر سکتا ہوں سوائے اس کے کہ اے معزز ہستی ہم آپ کے مشکور ہیں۔"

میں نے یہ سب بڑے صبر سے سنا۔ سنتے وقت بہت سے ماضی کے واقعات میری نظر کے سامنے آتے جاتے تھے۔ بیان ختم ہونے کے بعد ہی میں نے کھڑے ہو کر کہا

"دوستو! میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں۔ یہی ایک خواب تھا جس کو حقیقت بنتے دیکھنے کے لئے لاکھوں نے اپنی زندگیاں اور سب کچھ قربان کر دیا۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ اس خواب کو جیتا جاگتا دیکھ کر میرے دل میں کیسی خوشی ہوتی ہے۔ ابھی آج کی دنیا کا کتنا حصہ میں نے دیکھا ہی ہے لیکن جو کچھ دیکھا ہے وہی کیا کم ہے، مان لو آج میں اگر انیس سو تئیس کے کسی گاؤں میں جاتا تو یہ سیب گاؤں ملتا؟ آپ کی پانچ ہزار کی آبادی کا یہ گاؤں ہے۔ ایسے ہی اُس گاؤں کی اُس وقت کی حالت سناتا ہوں مٹی کے کچے مکان جس میں کہیں کہیں مکانات کی مٹی گر گئی ہے۔ کہیں ایک کونہ کھسک پڑا ہے۔ پھوس کی چھت اور ٹوٹی پھوٹی کھپریل۔ دس گھر میں شاید دو گھر ایسے ہیں جن میں برسات کی بوندیں اندر نہ ٹپکتی ہوں جگہ جگہ پتلی پتلی گلیوں میں کوڑا کرکٹ کا انبار لگا ہے۔ وہیں نابدان کا سڑا پانی بہہ رہا ہے لڑکے وہیں پاخانہ کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔ برسات کے دنوں میں تو اور بھی سڑ سڑ کر کیچڑ اور بدبو کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ بستی کے چاروں طرف کے کھیت ہی لوگوں کے پاخانہ جانے کی جگھیں تھیں۔ کتے جگہ جگہ پھرتے رہتے تھے۔ کسی طرح بڑی مشکل کے ساتھ جس راستہ سے بیل گاڑی گزر سکے وہیں اس وقت کی سڑک تھی۔ آج کل وہ بیل گاڑیاں اور یکے

کہاں ہیں؟ قدیم زمانہ میں ان چیزوں کو عجائب گھر میں آپ لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ وہی اس زمانہ کی سواریاں تھیں دولت مند لوگ اچھے اچھے گھوڑوں کی گاڑی رکھتے تھے، ہاتھی بھی سواری کے لئے رکھے جاتے تھے۔ اب تو آپ کے یہاں موٹر ہی سواری کے لئے، موٹر ہی لادنے اور لے جانے کے لئے گاؤں کے سبھی کام کے لئے موٹر ہی استعمال ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ کام آدمی یا بیل گاڑی سے ہوتے تھے میں نے بھی کئی بار رات رات بھر بیل گاڑی پر چڑھ کر آٹھ دس کوس کا سفر طے کیا تھا۔

ہاں تو میں اس زمانہ کے گاؤں کا حال بیان کر رہا تھا۔ درمیان میں گاؤں کی اس پتلی سڑک کے دونوں طرف دوکانیں ہوتی تھیں جن میں حلوائی، بتاشے اور لڈو بیچتے تھے۔ بزاز کپڑے، پنساری رنگ مسالہ، کوئی ساگ ترکاری، کوئی سوئی دھاگہ، کوئی نمک، تیل بیچتا تھا۔ ہفتہ میں ایک یا دو دن بڑے ہاٹ لگتے تھے۔ جب کہ آس پاس کے گاؤں سے ضرورت کی چیزوں کو خریدنے کے لئے۔ زیادہ آدمی آیا کرتے تھے۔ کوئی پیسوں سے چیزیں خریدتا تھا کوئی اناج سے بدلتا تھا۔ دوکاندار اس خرید و فروخت سے کچھ پیسے حاصل کر کے اپنا نباہ کرتے تھے۔ لوگوں کی حالت کیا پوچھتے ہیں آپ لوگوں کو تو اس زمانہ کا سب سے دولت مند آدمی بھی دیکھتا تو دیوتا سمجھتا۔ پانچ چھ سال کے لڑکے چار انگل کپڑے کی لنگوٹی باندھے پھرا کرتے تھے۔ کچھ امیروں کو چھوڑ کر عام طور سے سبھی ایک انگوچھا اور ایک دھوتی سے اپنا کام چلاتے تھے وہ بھی میلی کچیلی اور بہتوں کی دھوتی تو پھٹا سا چیتھڑا ہوتی تھی۔ عورتیں ایک میلی ساڑی میں سال بھر گزارا کرتی تھیں اور چیتھڑے ہو جانے پر بھی پیوند لگا کر پہنتی ہی چلی جاتی تھیں۔ میں نے بندیلکھنڈ میں ایسی بہت سی عورتیں دیکھی تھیں جنکا لہنگا ایک دم پرزے پرزے ہوگیا تھا اور صرف گھیر کے چناؤ کی وجہ سے آر پار نظر نہیں آتا تھا۔ شاید ہی کہیں ایک انگل ثابت کپڑا بچا ہو۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھیں۔ مفلسی ہی اس قسم کی تھی عورتوں کا جوتا پہننا

اس زمانہ میں بہت سی ذاتوں میں تو گناہ سمجھا جاتا تھا دوسرے پہننے کے لئے نصیب بھی مشکل سے ہوتا تھا۔ جاڑے کے دنوں میں پھٹے چیتھڑوں کو سی کر اگر کسی نے ایک گدڑی بنالی تو سمجھ جاؤ کہ اس نے بڑا عیش پا لیا۔ پیال بچھا کر لڑکے بالے سب اسی گدڑی کے نیچے دبک کر سو جاتے تھے۔ سونے کے لئے چارپائیاں سب کو نصیب نہ تھیں۔ کپڑوں کی تنگی سے بہتوں کو جاڑا بھی پیال اوڑھ کر کاٹنا پڑتا تھا۔ لکڑیاں کہاں نصیب تھیں کہ آگ تاپتے۔ اگر کوئی گھاس پھوس اکٹھا کر پاتا تھا تو بڑی خوشی سے اس کے کنارے بیٹھ کر گھر والے اس کا دھواں لیتے تھے۔

مجھے خوب یاد ہے۔ ایک دفعہ جاڑے کے دنوں میں بہت سویرے ہی میں ایک راستہ سے گزر رہا تھا اسی راستہ پر پھٹی پرانی میلی کچیلی ساڑی پہنے ایک بڑھیا سوپ میں کچھ لئے آرہی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے دو لڑکے چار پانچ سال کے چلے جارہے تھے۔ ان میں سے بڑے کے پاس ایک لنگوٹی اور چھوٹے کے بدن پر ایک سوت بھی نہیں تھا۔ ماگھ پوس کا جاڑا تھا اور سردی کے مارے دونوں بچے ٹھٹھرے جارہے تھے۔ انھوں نے اپنے بازو کو باندھ کر کمر جھکالی تھی۔ ایسے لڑکے ایک دو نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں اس زمانہ کے ہندوستان میں تھے۔

سڑی گلی اور خراب غذا بھی اس زمانہ میں کروڑوں آدمیوں کو پیٹ بھر نہ ملتی تھی۔ بہت سے لوگ پیٹ کے لئے گاؤں گاؤں بھیک مانگتے پھرتے تھے میں نے اپنی آنکھوں سے ایسے لڑکوں اور آدمیوں کو دیکھا تھا جو کہ پھینکے ہوئے جھوٹے ٹکڑوں کو کتوں کے منہ سے چھین کر کھا جاتے تھے۔ یہ بات نہیں کہ لوگ محنت سے گھبراتے تھے دو چار چاہے ویسے بھی ہوں لیکن زیادہ تر ایسے تھے جو رات کو چار بجے سے رات کے آٹھ دس بجے تک بھوکے پیاسے کھیتوں دوکانوں اور کارخانوں میں کام کرتے تھے پھر بھی ان کو پیٹ بھر کھانا اور ضرورت کے مطابق موٹے جھوٹے کپڑے تک میسر نہ تھے بیمار ہو جانا

ان کے لئے اور بھی آفت تھی۔ ایک طرف بیماری اور دوسری طرف ڈاکٹروں اور دواؤں کا قحط اور اس پر کھانے کا کہیں ٹھکانا نہیں تھا۔ ۱۹۱۸ء کے دسمبر کا زمانہ تھا جبکہ صرف انفلوئنزا سے اور وہ بھی صرف چار پانچ ہفتوں کے اندر اندر ساٹھ لاکھ آدمی ہندوستان میں مر گئے۔ مرنے والے زیادہ تر غریب تھے جن کے پاس نہ سردی سے بچنے کے لئے کپڑا، نہ کھانے کے لئے غذا، نہ دوا کے لئے دام، اور نہ رہنے کے لئے صاف مکان تھے۔ وہ جانوروں کی سی زندگی نہیں بلکہ دوزخ کی زندگی بسر کرتے تھے، آدمی، کتّے، بلّی کی موت مرتے تھے۔ مجھے آج کل کی زبان کا علم نہیں اس لئے ایسی پرانی زبان میں بول رہا ہوں ڈر ہے کہ آپ لوگوں کو سمجھنے میں دقّت ہوتی ہوگی۔

خواتین اور دوستو! جس زمانہ میں ملک کے زیادہ تر لوگ اس قسم کی زندگی گزار رہے تھے اس زمانہ میں بہت کم آدمی ایسے تھے جو اُن سے کچھ اچھی حالت میں تھے جنھیں اس زمانہ کی اصطلاح میں کھاتا پیتا آدمی کہتے تھے۔ ہاں انگلیوں پر گنے جانے والے ایسے آدمیوں کا بھی شمار تھا جنھیں تمام نعمتیں حاصل تھیں۔ یہ لوگ دولتمند تھے اور نواب، راجا، بابو، تعلقدار، زمیندار، سیٹھ، ساہوکار، مہاجن کارخانہ دار کے ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ اگرچہ ایک آدھ ان میں سے ایسے نکل آتے تھے جنھیں مصیبت زدہ لوگوں کی تکلیف کا احساس تھا۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ امیر لوگ بڑے بڑے محلوں میں رہتے تھے جو دو محلے، چو محلے، اور پنج محلے ہوتے تھے۔ ان کو صرف اپنے جسم کی دیکھ بھال کے لئے بہت سے مرد و عورتوں اور خدمت گاروں کی ضرورت ہوتی تھی۔ بہت سے راجاؤں کے پاس تو دو دو تین تین سو لونڈیاں ہوتی تھیں۔ دو دو چار چار سو عورتوں سے ان کا حرم بھرا رہتا تھا۔ اُس پر بھی یہ لوگ محافظ تحت شمار کئے جاتے تھے۔ کسی کی عزت بگاڑ دینا۔ کسی کا حق لوٹ لینا ان کے اشاروں کا کام تھا جب یہ چلتے تھے تو ان کے آگے پیچھے سینکڑوں آدمی ان کے جسم و جان کی حفاظت کیلئے

چلتے تھے۔ کتنے تو پالکیوں پر نکلتے تھے جنھیں آدمی ہی ڈھوتے تھے گالی تو ہمیشہ ان کی زینت
زبان رہتی تھی ذرا ذرا سی بات پر وہ اپنے آدمیوں کی گالیوں سے خاطر کیا کرتے تھے آپ
سو رہے ہیں دوسرے ان کے پیر دبا رہے ہیں۔ پنکھا جھل رہے ہیں، یہ لوگ اپنے ہاتھ سے
کوئی کام کرنا اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ ایک آدمی کے لئے بہت سی موٹریں، گھوڑے گاڑیاں،
سواری کے گھوڑے اور ہاتھی ہوتے تھے۔ ان میں بہت سے تو دن رات شراب، بھنگ،
افیون کے نشے میں مدہوش پڑے رہتے تھے خود محنت نہ کرتے تھے مگر دوسروں کی محنت کی
کمائی کا حصّہ ہضم کرنے کے لئے تیار رہتے تھے دوسروں کے زخم پر آہ کرنے والے تو کم لیکن
نمک چھڑکنے والے زیادہ تھے۔ صرف اپنے کھانے کپڑے پر یہ لوگ جتنا خرچ کرتے تھے
اُتنے سے ہزار آدمی آرام دہ زندگی گزار سکتے تھے۔ ان کے اکیلے رہنے کے لئے سینکڑوں آدمیوں
کے رہنے کے لائق مکانات تھے۔ اس پر طرہ یہ تھا کہ ظلم، دغا اور فریب کے بانی ہونے پر
بھی یہ لوگ مذہب کے پجاری بن کر قسمت کے ٹھیکہ دار بن بیٹھے تھے۔ اُن کے سامنے
انسانیت کی کوئی قیمت نہ تھی۔ ان کا جادو۔ جج، پنڈت، مولوی اور پادری سب پر تھا
سب ان کی ہاں میں ہاں ملاتے اس کے علاوہ ان کے فائدہ کے لئے اپنی اپنی مذہبی
کتابوں سے فتوے دینے کے لئے تیار رہتے تھے پنڈت کہتے "لوگ، دولت مند غریب،
راجا اور رعایا اپنی اپنی گذشتہ زندگی کی کمائی سے ہوتے ہیں۔ یہ ازل سے چلا آیا
ہے۔ یہی بھگوان کی خواہش ہے۔ وید پُران سب اس کے گواہ ہیں۔" مولوی کہتے تھے "خدا
نے دنیا کی بھلائی کے لئے امیر، غریب، بادشاہ اور رعیت کو پیدا کیا ورنہ دنیا کا کام کیسے
چلتا۔ سارے رسول، پیمبر اس بات کے قائل اور اپنی قسمت پر قانع تھے۔ بادشاہ اور مالک
پر خدا کا سایہ ہے۔" اسطرح یہ تمام لوگ ایک ہی سُر الاپتے تھے۔ اصل بات تو یہ تھی کہ لاکھوں
محنتی اور بیکسوں کا حصّہ چھین کر دولتمند لوگ اس میں سے کچھ ٹکڑا اُن کے سامنے بھی پھینک
دیتے تھے۔ اسلئے یہ لوگ ہاں میں ہاں ملانا اپنا فرض سمجھتے تھے شکر ہے کہ اب وہ طلسم ٹوٹ گیا۔

اب تو آپ لوگوں کو یہ باتیں سُن سُن کر تعجب ہوتا ہوگا کیا وہ لاکھوں آدمی واقعی بھیڑ کی مانند تھے جنھیں ایک دولتمند آدمی اپنی انگلی کے اشارہ پر نچاتا تھا۔ اگر وہ لوگ ذرا بھی اپنی عقل سے کام لیتے تو کیوں غلامی میں پڑے رہتے۔ آج یہ سوچنا بہت آسان ہے۔ لیکن اُس زمانہ میں ایسا سوچنا مشکل معلوم ہوتا تھا اور شیخ چلی کا محل کہلاتا تھا۔ آج کی حالت کے بارے میں سوچنے والے اُس زمانہ میں پاگل، خبطی، لامذہب اور انسانیت کے دشمن سمجھے جاتے تھے۔ تعلیم حاصل کر کے اکثر لوگ اُس ملکیت دار طبقہ میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ چاہے ہزار میں دو ایک ہی ہو پاتا ہو۔ تعلیم دینے والے اور دولت مند تو اس مسئلہ پر سرے سے غور ہی نہیں کرتے تھے اور بیچارے غریب اسے غیر ممکن سمجھتے تھے وہ اپنے ہی فرسودہ خیالوں سے اس طرح جکڑے تھے کہ انھیں ایسا ہونا غیر ممکن معلوم ہوتا تھا۔ آپ کہیں گے کیسی حماقت تھی کہ اپنی محنت کی کمائی دوسروں کے حوالے کر دیتے تھے۔ اتنی سی بات کا سمجھنا کون مشکل تھا لیکن ان کے لئے اتنی سی بات کا سوچنا چنے چبانا تھا۔ ادھر دولت مند طبقہ کی طرف سے کہا جاتا تھا کہ اگر یہ نظام قائم نہ رہا تو مذہب نہ رہیگا۔ ذات کی عزت چلی جائیگی۔ کلجگ آجائیگا۔ بدقسمت اور مزدور پیشہ لوگ بھی اونچ نیچ کے خیالات میں مبتلا تھے۔ بہار کا برہمن ذات کا ایک مزدور پیشہ یوں سوچتا تھا غریب ہیں تو کیا کھانے کو نہیں ملتا تو کیا لیکن چمار، اہیر، راجپوت مودبانہ تسلیم تو کرتے ہیں۔ مہاراج تو کہتے ہیں۔ چمار اور اہیر ہمارے برابر کس طرح ہو جائینگے۔ سچ مچ بڑی بے انصافی ہوگی۔ بھوکا مرنا اچھا، اپنی کمائی دوسرا کھائے وہ بھی اچھا لیکن چمار کو اپنے ہی جیسا انسان سمجھنا ٹھیک نہیں۔" اس طرح اپنے سے اونچی ذات کے پٹھان، سید کے غرور کو چاہے گاؤں کا مومن یا جلاہا دل سے اچھا نہ سمجھتا ہو لیکن خود سے نیچے گنے جانے والے بھنگی کو اپنے برابر ہونے دینا اُسے بھی گوارا نہ تھا۔

اب آخر میں آپ کے موجودہ نظام کے بارے میں کچھ کہکر میں اپنا بیان ختم کرتا ہوں۔

سب سے پہلے تو یہ کہ یہ نہ سمجھ بیٹھئے کہ ہم اب ترقی کی آخری حد کو پہنچ چکے ہیں۔ اب ہماری تمام کوششیں اور ترقیاں تکمیل حاصل کر چکی ہیں یا اب ہم میں کسی بات کی کمی نہیں رہی جس وقت یہ خیال پیدا ہو گا اسی وقت سے آپ پیچھے کی طرف ہٹنے لگیں گے اور آپ کا زوال شروع ہو جائیگا۔ انسان کہاں تک ترقی کر سکے گا اس کی کوئی حد مقرر نہیں ہے جس طرح کچھ دن پہلے علم نجوم میں بہت دور ایک ستارہ ظاہر ہوا تھا پھر بعد میں اس سے بھی دور دوسرا ستارہ دریافت ہوا۔ اسی طرح لاکھوں سال تک دور سے دور ستاروں کا دوربینوں اور کیمرہ کی مدد سے پتہ لگتا جائیگا۔ بالکل اسی طرح ہماری ترقی ہمارے رفارم کے میدان کا بہت دور تک پھیلاؤ ہے۔ اُس زمانہ میں تعلیم میں ترقی کی جو حد تھی اب وہیں سے اس کی ابتدا ہے آپ کا سماج بہت تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ ہے لیکن آپ ترقی کر کے آج کی حد کو کل کی ابتدا بنا سکتے ہیں۔ آپ کے جانشینوں کو یہ حق حاصل ہے۔ یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ آج علم پوری انسانی نسل کے مفاد کے لئے استعمال ہوتا ہے اور آج علم کا وہ مقصد نہیں جو دو سو سال پہلے تھا۔ آج کی تمام دولت علم اور صرف علم ہے۔ جس کی کمی کی وجہ سے گذشتہ زمانہ کے لوگ انسانیت سے گرے ہوئے تھے۔ علم کی ترقی میں روڑے اٹکانا اور اس کی اشاعت میں تساہلی برتنا ہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ ترقی کی خواہش اور علم کا زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ ہی خاص باتیں ہیں جن سے آپ نے ابتک ترقی کی ہے اور آگے بھی لامحدود میدان پڑا ہے۔ میں آپ کے محبت آمیز برتاؤ سے بے حد مسرور اور مطمئن ہوں اور بس۔"

میری تقریر کے اختتام پر ساتھی اسمٰعیل نے ایک بار اُٹھ کر پھر میرا شکریہ ادا کیا اور میٹنگ ختم ہوئی۔ میں دشواامتر اسمیل دیومتر، اسمٰعیل کی بیوی پریم بدا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ قیام گاہ پر آیا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ میں نے اُن کی اطلاع کے لئے اور ان کی درخواست کے جواب میں مختصراً کہا۔ کل پرسوں اور چوتھے

دن میں یہیں رہ کر آس پاس کا اور آپ کے گاؤں کا جائزہ لونگا۔ اس کے بعد پروفیسر وشوامتر کے ساتھ یہاں سے سیدھے نالندہ جاؤنگا۔ وہاں سے ہندوستان کی خاص خاص جگہوں کی سیر کر کے پھر کہیں باہر قدم رکھوں گا۔ آپ اپنے عالمگیر بین الاقوامی مجلس کے صدر کو بھی اس کی اطلاع دے دیں۔" دیو متر نے کہا کامریڈ اسمعیل اور اُن کی بیوی پریم بدا بھی آپ کے ساتھ رہینگے اور آپ کو یہاں کے حالات سمجھنے میں مدد دینگے۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد سب لوگ اپنی جائے قیام پر چلے گئے۔ رخصت ہوتے وقت اسمعیل جی نے بھی سلام نہیں کیا۔ مجھے پہلے ہی سے ان لوگوں کے مذہب سے دور ہو جانے کی جھلک نظر آئی تھی اور پوچھنے کی خواہش بھی ہوئی تھی اب وہ خواہش اور زیادہ بڑھ گئی۔ وشوامتر پاس ہی بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا۔" وشوامتر۔ اگرچہ میں نے لوگوں کے نام ہندو مسلمان جیسے سنے لیکن ان کی پوشاک، بات چیت اور سلام دعا میں کوئی فرق نہیں ملتا۔ کیا تمام مذاہب اب ایک ہو گئے ہیں؟"

" ایک نہیں ہو گئے۔ بلکہ یہ ہے کہ ان مذہبوں کو بھی ہم نے نکال پھینکا۔ ناموں میں بھی بہت تبدیلی ہو گئی ہے پھر بھی لوگ جیسی خواہش ہوتی ہے ویسا نام رکھ لیتے ہیں۔

سارے ملک کی ایک زبان ہے جسے آپ کے زمانہ کی ہندی اردو کا ملاپ کہنا چاہئے یہی ایک زبان ہر جگہ بولی جاتی ہے۔ خط بھی ناگری ہے۔ اب زبان کی مشکلات باقی نہیں رہی مختلف صوبوں میں ادبی نکتۂ نگاہ سے دوسری زبانیں بھی رائج ہیں۔ لیکن پورے ملک کی مشترکہ زبان ہندوستانی ہے اب پرانی جانب داری باقی نہیں رہی اس لئے سب کی زبان، طور طریقے اور لباس ایک سے ہو گئے ہیں۔

میں نے زیادہ دیر تک گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مختلف اوقات اور ان کے استعمال کا مجھے علم ہو گیا تھا چنانچہ میں نے سوچا کہ سونے کا بھی کوئی خاص قاعدہ ہوگا۔ وشوامتر اپنے کمرہ میں سونے چلے گئے میں بھی اپنی خواب گاہ میں پلنگ پر جا لیٹا۔ ابھی میری آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ سامنے دیوار سے ملحق بجلی کا قمقمہ اپنی ہلکی ہلکی روشنی پھیلا

رہا تھا اور کمرہ کی اندرونی فضا میں آرام دہ حرارت پیدا ہو رہی تھی۔ چھ روز کا نوخیز چاند شاخوں کے جھرمٹ میں سے میرے دریچہ میں جھانکنے لگا تھا۔ دور پہاڑوں کا سلسلہ افق پر لہرا رہا تھا جس پر چاندنی مسکرا رہی تھی۔ رات پُر امن اور خاموش نیندوں کی آغوش میں محو استراحت تھی۔ بستر پر آنے کے ساتھ ہی ریل کے پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دی۔ رات کی اس خاموشی اور سکوت میں آج کے مختلف مناظر ایک ایک کر کے نظروں کے سامنے آنے لگے۔ ساتھ ہی دل نے ان واقعات اور مناظر پر آزاد تبصرہ شروع کر دیا پہلے عورت کی آزادی کا خیال سامنے آیا۔ اس زمانے میں ایک ایک ہاتھ کا گھونگھٹ اور برقعوں کی بورا بندی اب کیوں دکھائی دینے لگی۔ اب "دو بیس" اور "چار بیس" شمار کرنے والی عورتیں کہاں ملیں گی۔ دولت مندوں کا خیال آتے ہی میں نے سوچا۔ تو اب گویا راجا بہادر، رائے بہادر، خان بہادر، نواب کے خطاب حاصل کرنے کے لئے کوئی نہیں مرتا۔ اور یہ خطاب کے عطا کرنے والے بھی اس کرۂ ارض سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

گاؤں کا منظر سامنے آتے ہی قدیم گاؤں کی تصویر دھندلانے لگی۔ میں نے دل میں سوچا کہ وہ گاؤں سوائے جادو گھر کے اب کہاں نظر آسکتا ہے۔

ایک ایک کر کے تبصرے ختم ہوئے۔ گیارہ کا گھنٹا بج چکا تھا۔ میں نے کہا اب بارہ بھی تھوڑی دیر میں بجنے والا ہے۔ کل کے متعلق کچھ سوچ کر سو جانا اچھا ہے۔ میں نے یوں اپنے دماغ میں پروگرام بنایا "سیب گاؤں کی باتیں تو معلوم ہو ہی گئیں۔ گھروں اور عمارتوں کے متعلق بہت کچھ جان لیا۔ ٹاؤن ہال، طعام گھر بھی دیکھ ہی لیا۔ سمید نے کہا تھا کہ تین سال کے بعد ہی بچے اسکولوں میں بھیج دئے جاتے ہیں۔ دیکھنا ہے کہ

تین سال تک کے بچے کیسے رہتے ہیں۔ اسپتال بھی دیکھنا باقی ہے گاؤں کی صفائی اور انتظام وغیرہ کے متعلق ابھی بہت سی باتیں جاننی ہیں۔ یہی گاؤں سے متعلق خاص باتیں ہیں۔ اسمعیل اور وشوامتر دونوں کو بہت کافی معلومات حاصل ہیں ان کے ساتھ ان مقامات کی سیر کرنا اور بھی اچھا ہوگا یہ سوچ کر میں سوگیا۔

# باب ششم

# دیہات اور دیہاتی

پانچ بجنے سے پہلے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں بستر سے اٹھ کر اس وقت کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چاروں طرف تارے بکھرے تھے۔ چاند میرے سامنے نہیں تھا لیکن چاندنی نظر آتی تھی۔ چاندنی میں کھڑکی سے باہر لتر پر لدے ہوئے پھول صاف نظر آرہے تھے۔ گلاب کی بھینی بھینی خوشبو دبے پاؤں کمرہ میں داخل ہورہی تھی اب دس پانچ ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ گولہ چھوٹنے کی آواز آئی۔ پانچ بج گئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں دیو بھی آگئے انھوں نے پہلے جھانک کر دیکھا۔ جب مجھے بیٹھا پایا تو اندر آگئے۔ پوچھا کیا غسل ابھی کیجئے گا۔ اگر ابھی کرنے کا ارادہ ہو تو یہیں گھر کا غسل خانہ حاضر ہے ورنہ "عوامی غسل خانہ" کے گرم نل پر چلے جائیے۔

میں نے کہا "میں یہیں غسل کروں گا"۔ کل تو مجھے حاجت ضروری کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اب دیو نے بتلایا کہ پیچھے کی طرف پائخانہ ہے۔ ہر مکان کا الگ الگ پائخانہ ہے جس میں نل لگا ہوا ہے۔ نل گھما دینے سے پانی کی تیز دھار آتی ہے اور گندگی کو نل کے ذریعہ بہالے جاتی ہے۔ بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ بھنگی کا اب وجود ہی نہیں۔ ہاں نل بگڑ جانے پر کوئی بھی آدمی جو نلوں کے سدھارنے پر مقرر ہے اسے ٹھیک کر دیتا ہے۔ سارے گاؤں کی گندگی بڑے بڑے نلوں کے ذریعہ

دو تین کوس کی دوری پر جاتی ہے۔ وہاں پر بڑے بڑے گڈھے مشین سے کھدے ہوئے تیار رہتے ہیں۔ نیچے بھی مٹی کھدی رہتی ہے اور آس پاس کی گلی رہتی ہے مگر گندگی گرتی جاتی ہے اور ادھر مشین اُس پر مٹی پھینکتی جاتی ہے۔ مشینیں بجلی کے زور سے چلتی ہیں اور چلانے والے بھی دور رہتے ہیں، اگرچہ مٹی سے ڈھکے رہنے اور کھلی ہوا سے گندگی کا طاپ نہ ہونے سے وہاں بدبو نہیں پھیلتی پھر بھی محرک صرف مشین کے بگڑ جانے پر وہاں جاتے ہیں۔ ایک گڈھے کے بھر جانے پر پہلے سے دوسرا گڈھا تیار رہتا ہے۔ اس طرح ایک بھرا گڈھا چار سال تک بند چھوڑ دیا جاتا ہے بعد میں کھود کر اس میں اور کچھ کھاد ملا کر درختوں کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ میں اپنے بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے پاخانہ گیا۔ وہاں کمال کی صفائی اور پاکی تھی۔ میں مکان کی پچھلی طرف نہیں گیا تھا اب میں نے دیکھا کہ مکان سے دس دس ہاتھ تک زمین میں ویسے ہی پھول بیل بوٹے لگے ہوئے ہیں جیسے کہ سامنے کی طرف تھے۔ مہمانوں کی قیام گاہ کی پوری عمارت کے آگے پیچھے ایک پارک کی طرح یہ پھلواری بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے میں نے بعد میں دیکھا کہ سبھی مکانات کا وضع قطع ایک ہے۔ اپنے گھروں کے آمنے سامنے باغات کو ٹھیک رکھنا اپنے اپنے گھروں کو صاف ستھرا رکھنا گھر والوں کا اپنا کام ہے۔ میں پاخانے سے فارغ ہو کر غسل خانے میں گیا۔ جاکر دیکھا کہ ٹھنڈے اور گرم پانی کے دو نل لگے ہیں۔ سفید دودھ کی مانند چینی کا پتھر سا مضبوط دو ہاتھ لمبا ڈیڑھ ہاتھ چوڑا، دو ہاتھ گہرا ٹب کیا ایک پورا حوض زمین میں گڑا ہوا ہے، نل کے بغل میں دیوار سے ملحق ایک جگہ پر صابن کی ٹکیہ اور اس کے اوپر والی کھونٹی پر ایک سفید تولیہ اور ایک دُھلی ہوئی لنگی آویزاں ہے۔ گرم پانی کا نل کھلا ہوا تھا اور حوض لبالب بھرا تھا، پھر بھی پانی اوپر سے نہیں نکلتا تھا۔ میں نے ہاتھ

پاؤں دھویا۔ سوچا کہ اب مسواک کرنا چاہیئے۔ مسواک تو نظر نہ آیا۔ ہاں صابن کے پاس ایک چاندی کی ڈبی پر ایک دانت کا برش دیکھا۔ کھولنے پر ڈبیا کے اندر خوشبودار ٹوتھ پیسٹ ملا۔ میں نے سوچا اب مسواک کا رواج نہیں رہا۔ بعد میں وشوامتر نے اصل وجہ یوں بتائی۔ ایک ہی سیب گاؤں کے لئے پانچ ہزار مسواک چاہیں لیکن اب فضول کے درخت تو یہاں نہیں ہیں۔ اگر اچھے درختوں سے مسواک توڑے جانے لگیں تو اکثر ایک دو پیڑ ہر گاؤں میں خراب ہو جائیں۔ پھر تمام دنیا کے آدمیوں کی تعداد تو ڈیڑھ ارب ہے۔ اسی لئے برش اور منجن کا انتظام کیا گیا ہے۔ انار، بادام وغیرہ کے چھلکوں کو ہم بے کار نہیں جانے دیتے۔ اُسی سے منجن یا کوئی اور کام کی چیز بنائی جاتی ہے۔

میں نے برش اور پیسٹ سے دانت صاف کئے اور حوض میں داخل ہو کر صابن سے مل مل کر خوب نہایا۔ جب میں نہا دھو کر کپڑے بدل چکا تو دیو نے آ کر ایک پرزہ گھمایا اور ٹب کا پانی نکل گیا۔ غسل خانہ ہی میں ایک اور کھڑکی کے پاس ایک طرف ایک اونچی سی صاف ستھری جائے نشست تھی۔ میں نے وہاں جا کر ورزش کی۔ اس کے بعد بیٹھنے کے کمرہ میں آیا۔ آفتاب کی سُرخی مشرق میں پھیلی ہوئی تھی اور اُس کی ہلکی پھلکی کرنیں دامن مشرق کا احاطہ کر رہی تھیں۔ پرندوں کا دلکش نغمہ جاری تھا۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے سامنے پھولوں کی ڈالیوں کو ہلا رہے تھے۔ سڑک اور سامنے کے گھروں کی نفاست اور صفائی دلکش انداز سے مسکرا رہی تھی اور میرے دل میں ایک اتھاہ مسرت اور احساس اطمینان لہریں لے رہا تھا۔

وشوامتر بھی آ گئے۔ ان کے ساتھ پدماوتی بھی تھیں۔ میرے کہنے پر وہ دونوں بھی پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ لیکن چہرہ کے علاوہ اُن کا سارا جسم ڈھکا ہوا تھا اگرچہ اس گرم مکان میں کوئی خاص سردی بھی نہ تھی۔ گفتگو کا سلسلہ پھر چھڑ گیا

جس کا موضوع آج کل کی باتیں تھیں۔ مردوں اور عورتوں کا لباس دیکھنے میں یہی نہیں کہ بہت خوبصورت تھا بلکہ اس میں کوئی چیز بیکار، بلا غرض اور صحت کے لیے نقصان دہ نہ تھی۔ میں نے کام کے وقت عورتوں اور مردوں دونوں کو اُونی جانگیہ، لمبا موزہ اور سارہ پاؤں ڈھک دینے والا ایک خاص قسم کا جوتا پہنے ہوئے دیکھا۔ میں نے تعجب سے دیکھا کہ وہاں چمڑے کی کوئی چیز نہ تھی۔ جوتے بھی ایک قسم کی موٹی زین کے تھے (جو دیکھنے میں چمڑے ہی کی طرح معلوم ہوتے تھے) ان کے تلے ٹھوس ربر کے تھے۔ کرتوں کے نیچے ایک گرم کوٹ اور سر پر ایک ہی قسم کی ٹوپیاں تھیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے یہ پوشاک کام کے وقت بھی تھی کیونکہ رات کو کھانے کے وقت اور ٹاؤن ہال میں وہ پوشاک نظر نہیں آئی۔ ان جگہوں پر لوگ ایک قسم کی گول ٹوپی، پیروں تک لمبے کوٹ اور پتلون پہنے تھے۔

عورتوں کا لباس جوتہ، موزہ، ساری اور کرتی ہیں۔ زیادہ سردی ہو تو ایک لمبا گرم کوٹ بھی پہن لیتی ہیں اور ٹوپی بھی اوڑھ لیتی ہیں۔ عورت یا مرد کوئی کسی قسم کا زیور نہیں پہنتا۔ کلائی یا پاکٹ کی گھڑی کا بھی رواج نہیں۔ کمزور نظر والے جنہیں ضرورت ہے عینک لگاتے ہیں۔ ہر شخص کے پاس ایک ایک فونٹن پن اور ایک ایک روزنامچہ ہوتا ہے۔ کل کی باتیں جب لکھنے کی میری خواہش ہوئی تو مجھے بھی ایک بڑا روزنامچہ اور ایک فونٹن پن ملا۔ نب خالص سونے کی تھی: شاید سختی پیدا کرنے کے لئے کچھ ریڈیم نوک پر لگائی گئی تھی۔ کلپ بھی سونے کی تھی۔ بات یہ ہے کہ اب لوگوں کے پاس سونے کا اور استعمال ہی کیا تھا۔ پونڈ اور مہر کا رواج ہی اُٹھ گیا۔ نہ لوگ زیور پہنتے ہیں اور نہ زیور دفن کر کے رکھنے ہی کی ضرورت ہے۔ لہٰذا انھیں سب کاموں میں سونے کا استعمال ہوتا ہے

وشوامتر اور پدماوتی کے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اسمٰعیل بھی اپنی ساتھن "پریم بلا"

کے ساتھ آ پہونچے اور اطلاع دی کہ اب سات بجنے والے ہیں۔ آج ناشتہ کے بعد "باغ طفلاں" دیکھنا اچھا ہوگا۔ "پریم بدا" وہاں کی مددگار نرس ہیں۔ ابھی یہ وہاں کی چیف نرس فاطمہ کو اس کی اطلاع دے آئی ہیں۔ میں نے بھی کہا اچھا۔ اس وقت باغ طفلاں کی سیر کی جائے اور دوپہر کے بعد اسپتال دیکھا جائیگا۔ اسی درمیان میں توپ کی آواز آئی اور ہم لوگ طعام ہال کو چلے۔

سڑک کے دونوں طرف آس پاس کے مکان کی زیب و زینت قابل دید تھی مکانوں کی ساخت میں توازن، صفائی اور حسن کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ پہلے کی طرح ہاتھ منہ دھو کر ہم لوگ کرسی پر بیٹھ گئے۔ ناشتہ کے لئے ایک ایک جلیبی، دو دو انڈے ایک ایک گلاب جامن طشتریوں میں رکھے تھے۔ دوسری طشتری میں تازہ خشک پھلوں کی قاشیں اور ایک گلاس صاف پانی کے علاوہ ایک خالی گلاس بھی رکھا تھا، جس میں گرم دودھ دیا گیا۔ گھنٹی بجنے کے بعد ہم نے کھانا شروع کیا۔ اب ہم لوگ یعنی وشوامتر، اسمعیل، پریم ودا اور میں وہاں سے باغ طفلاں کی طرف چلے۔ معلوم ہوا کہ باغ طفلاں گاؤں کے آخری سرے پر واقع ہے۔

راستے میں پوچھنے پر وشوامتر جی نے بتایا کہ اب پان ہی کا نہیں بلکہ بہت سی چیزوں کا رواج اٹھ گیا ہے۔ تمباکو، بیڑی، سگریٹ، شراب، گانجا، بھنگ ان میں اب کسی کا پتہ نہیں۔ بات یہ ہے کہ جو نشیلی چیزیں ہیں وہ تو ممنوعہ ہیں ان کا روکنا تو ان کے نقصان دہ ہونے کے خیال ہی سے ضروری تھا۔ لیکن جو غیر ضروری ہیں انھیں بھی قوم نے بند کر دیا ہے۔ کوئی چیز ایک فرد کے استعمال کے لئے تا وقتیکہ وہ اس کی صحت کے لئے مفید نہ ہو نہیں دی جاتی۔ سب [illegible] کے مطابق ایک قسم کی چیزیں مقرر ہیں۔ جو ضروری کپڑے سال بھر کے لئے ایک فرد کو ملتے ہیں سارے ملک میں وہی کپڑے ہر ایک کو ملتے ہیں۔ اگر پان کا انتظام کیا جائے تو سارے ملک کے لئے انتظام کرنا ہوگا۔ ہندوستان

میں پچیس کروڑ آدمی رہتے ہیں۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ اتنے آدمی کے لئے پان چھالیہ، چونا، کتھا وغیرہ تیار کرنے میں لاکھوں آدمیوں کو لگائے رہنا ہوگا۔ اتنی فضول خرچی قوم کس طرح برداشت کرسکتی ہے۔ جو لاکھوں بیگھے کھیت پان، تمباکو پیدا کرنے میں پھنسے رہتے ہیں آج ان میں اناج پیدا کیا جاتا ہے۔

میں نے کہا تمہاری آج کی قومی ترقی نے تو ساری خرابیوں کے لئے ایک ہی اکسیر ڈھونڈھ نکالا ہے۔ پھر میں نے پوچھا اب ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی کے الگ الگ کھانے کا تو جھگڑا نہیں رہا لیکن گوشت کھانے والوں کا کس طرح نباہ ہوتا ہوگا۔ اس وقت دشوامتر نے کہا۔ اب اصلی گوشت ملتا ہی نہیں، نقلی گوشت جتنا بھی چاہیں اتنا موجود ہے۔

"اور انڈا!"

"اُس میں تو بہت غذائیت ہوتی ہے۔"

"تو کیا اب یورپ اور امریکہ میں سور وغیرہ نہیں پلے جاتے؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ یہیں دیکھ لیجئے۔ کہیں کوئی جانور نہیں۔ اس سے پہلے میں بندروں کے متعلق بتا چکا ہوں۔ اس طریقے سے سور، کتا، بلی سب کو معدوم کر دیا گیا ہے صرف علم الحیوانات کے طالبعلموں کے تجربہ کے لئے کہیں کہیں انھیں پال کر رکھا گیا ہے"

میں نے پوچھا "چمڑے کا تم لوگوں نے استعمال چھوڑ دیا اس لئے گوشت چھوڑنے سے کوئی تکلیف نہیں اُٹھانی پڑتی ہوگی۔ لیکن اتنا دودھ کا جو خرچ ہے اس کیلئے تو گائیں بہت سی پالنی پڑتی ہوں گی۔ خیر مارنے سے نہیں تو اپنی موت سے ان میں ہزاروں مرتی ہوں گی۔ انکا چمڑہ بھی کیا مشینوں کے بلیٹ کے لئے کام میں نہیں لایا جاتا۔"

مشینوں کی بلیٹ بھی چمڑے سے کہیں زیادہ مضبوط کینوس کی بنتی ہیں۔ چمڑے کو الگ کرنا اُسکو سجھانا وغیرہ ایسا کام تھا جس سے آب و ہوا بہت گندی ہو جاتی تھی۔ لہٰذا وہ کام

ہی ترک کر دیا گیا" کوئی جانور مرتا ہے تو اسے کھود کر گاڑ دیا جاتا ہے۔ بعد میں اُسکا کھاد
کام میں لایا جاتا ہے۔ یوں تو جہانتک ہو سکتا ہے کوئی بھی چیز بیکار جانے نہیں پاتی۔
ہڈیوں کا ہم لوگ پورا استعمال کرتے ہیں۔ گوبر وغیرہ بھی کھاد کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

ہم لوگ باتیں کرتے جا رہے تھے۔ راستہ میں ملنے والے سبھی مرد و عورت میری طرف
دیکھتے چلے جاتے تھے۔ گاؤں پہاڑ کے نیچے اور ندی کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے
لمبائی میں زیادہ ہے، چوڑائی میں تو صرف پانچ سڑکیں ہیں۔ سڑکیں خوب چوڑی ہیں۔
جن کے دونوں طرف گھنے درخت لگے ہیں۔ ہر سڑک کے دونوں طرف رہنے کی عمارتیں
ہیں ہر ایک عمارت کا پچھلا حصّہ بعد والی عمارت کے پچھلے حصّہ سے ملحق ہے اور دونوں
کے باغ ایک ہی میں جڑے ہیں اس طرح چوڑائی میں چھ عمارتیں ہیں۔ گاؤں کی لمبائی
پورب پچھم ہے۔ ایک عمارت کے ختم ہونے پر اُتر دکھن جانے والی ایک سڑک ملتی ہے
اگر کوئی آدمی گاؤں کے صدر دفتر سے چلے تو ایک چوراہے پر مہمانوں کے قیام گاہ
کی عمارت ملے گی اس کے بعد معمولی مکانات ملیں گے اور تین چوراہے کے بعد چوتھے
پر ٹاؤن ہال ملیگا۔ جو دو عمارتوں کی جگہ گھیرتا ہے۔ یہ گاؤں کے کتب خانہ سے ملا
ہوا ہے اور اس کے ساتھ ایک بڑا ہال ہے۔ یہاں سے کتابیں ضرورت کیموافق
مختلف عمارتوں کے کتب خانہ میں جاتی ہیں۔ ٹاؤن ہال اور طعام خانہ کے درمیان
بس ایک سڑک ہے۔ گاؤں کی اہم سلائی "درزی گاؤں" میں ہوتی ہے۔ لیکن
درمیان میں مرمت اور جلدی کے کام کیضرورت پڑی تو صدر دفتر کے سامنے کی
عمارت موجود ہے جہاں سینے، رنگنے، بجلی کے شیشے لگانے اور بدلنے کے کام ہوتے ہیں اس
کے اتر طرف اس سے ملحق لانڈری ہے جہاں مشین کے ذریعہ کپڑے کی دھلائی اور استری
وغیرہ ہوتی ہے۔ کپڑوں کو سکھانے کے لئے یہیں بڑے بڑے گرم ہال ہیں ایک سڑک کے
اُس پار کھانے پینے کی چیزوں کا گودام ہے۔ اُسی سے ملحق موٹروں کے ٹھہرنے کی جگہ اور

مختلف اشیاء کا گودام ہے۔ آخر میں سامان کی مرمت کے کام کے لئے مستری خانہ ہے جہاں لوہار اور بڑھئی کا کام ہوتا ہے۔ ان تمام جگہوں پر وہی کام ہوتے ہیں جنکی جلدی رہتی ہے۔ نہیں تو وہ چیزیں ان گاؤں میں بھیج دی جاتی ہیں جہاں صرف انھیں کا کام ہوتا ہے۔ گاؤں کے تمام کارخانے پچھم اور اتر دکھن کی سڑک پر واقع ہیں۔ طعام خانہ ٹاؤن ہال، باغ طفلاں اور اسپتال گاؤں کے باہر پورب طرف ہے۔ لمبائی کی سڑکیں زیادہ چوڑی ہیں اور اُن کے کنارے سایہ دار درخت لگے ہیں۔

میری خواہش ہوئی کہ پہلے باغ طفلاں دیکھوں لیکن کھانے کا وقت ہو گیا تھا اسلئے طعام خانہ کی طرف مڑا۔ جب طعام خانہ میں گزر گیا تو گیارہ کی توپ چھوٹی ہاتھ منہ دھو کر کھانے بیٹھ گئے۔ اس وقت کا کھانا وہی تھا۔ جسے پہلے زمانہ کے الفاظ میں کچا بھوجن کہہ سکتے ہیں۔ یعنی روٹی، دال، بھات، ساگ، گوشت، کڑھی، پکوڑی، تمام چیزیں تھیں۔ میرے داہنی طرف وشوامتر اور بائیں طرف اسمیں بیٹھے تھے ہم لوگ ذرا پہلے پہنچ گئے تھے اس لئے دو ایک منٹ کی ابھی دیر تھی۔ میں نے کہا اتنے میں باورچی خانہ ہی دیکھ لوں طعام خانہ کے دکھن طرف باورچی خانہ تھا۔ جاکر دیکھا پکانے کے لئے بڑے بڑے برتن ہیں جنھیں اُتارنے اور چڑھانے کا کام مشینوں ہی سے لیا جاتا ہے۔ آٹا گوندھنا، روٹی بنانا بھی مشین ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ آگ کا کام بجلی دیتی ہے۔ اتنا بڑا باورچی خانہ جس میں پانچ ہزار آدمیوں کا کھانا پکتا ہے لیکن کہیں دھواں نہیں ہے۔ ہر ایک چیز کے ڈالنے اور اُتارنے کا وقت مقرر ہے۔ آنچ کا بھی ناپ ہے۔ لہذا کسی چیز میں گڑبڑی کی گنجائش نہیں۔ اگرچہ یہاں تمام چیزیں صاف ستھری ہوتی ہیں۔ پھر بھی "ماہرین غذا" جب تک کسی چیز کی اجازت نہیں دیتے اس وقت تک وہ چیز نہیں پک سکتی۔ یہ پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ اصلی گوشت اب نہیں ملتا ہے لیکن غذائیت کے خیال سے کئی ایسی چیزیں تیار کی گئی ہیں جنھیں لذت

مختلف قسم کے گوشت کی ملتی ہے اور خوبیاں بھی وہی ہیں۔ باورچی خانہ میں مرد و عورت دونوں قسم کے باورچی ہیں۔ کھانا نکال کر تھالیوں، کٹوریوں کو لکڑی کے تختوں پر سجایا جاتا ہے اور اُن کے بھر جانے پر انکو طعام خانہ میں بجلی سے گھما کر پہنچا دیا جاتا ہے۔ تختوں پر سے دو تین آدمی پلیٹیں اتار اتار کر میزوں پر رکھتے جاتے ہیں۔ کھانا ختم ہونے کے بعد پھر انھیں تختوں پر تھالیاں اور دوسرے برتن رکھ کر انھیں دھونے کے کمرہ میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں ان پلیٹوں کو گرم پانی اور کیمیائی چیزوں سے مشینیں صاف کرتی ہیں۔ بچا ہوا جھوٹا کھانا موٹروں پر لاد کر باہر ایک جگہ دفن کر دیا جاتا ہے جسکی کھاد بنتی ہے لیکن زیادہ تر لوگ اتنا ہی کھانا لیتے ہیں کہ زیادہ جوٹھا چھوٹنے نہ پائے۔

گھنٹی بجنے سے پہلے ہی ہم لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تھے۔ جی بھر کر خوب اچھی طرح کھانا کھایا۔ منہ ہاتھ دھو کر جب ہم اسپتال کی طرف چلے تو ہمارے ساتھ دیو متر بھی تھے، ہم لوگ اسپتال پہنچے۔ کامریڈ منورما اور انکی متعدد ساتھیوں نے دروازہ ہی پر ہمارا خیر مقدم کیا۔ ایک مددگار ڈاکٹر کے علاوہ تمام کارکن یہاں عورتیں ہی ہیں۔ مددگار طبیب منورما کے شوہر خسری رحیم بخش تھے دونوں میاں بیوی نے ٹکشیلا میں طبابت سیکھی تھی۔ اگرچہ اُن لوگوں کی پیدائش کشمیر کی تھی۔ میں نے سمجھا تھا کہ جب پانچ ہزار کی آبادی ہے تو مریض بھی اسی مناسبت سے ہوں گے لیکن یہاں کل پچاس مریض نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ صرف ایک بار سو تک مریضوں کی تعداد پہنچی تھی۔ کوڑھ، بواسیر، آتشک، دق، مرگی، دمہ وغیرہ امراض کا تو دنیا سے نام ہی اُٹھ گیا تھا، معمولی بخار، دردِ سر، بدہضمی، چوٹ وغیرہ یہی معمولی قسم کے امراض کا شکار ہو کر لوگ یہاں آتے ہیں۔ منورما نے کہا "اب طب کا زیادہ تر مطالعہ صرف مطالعہ کے خیال سے کیا جاتا ہے۔ دوا اور علاج کا تو یہ حال ہے کہ سرجری کی اور بھی کم ضرورت پڑتی ہے۔ آج سے دو صدی پہلے کے طبیبوں کو اسے بہت استعمال کرنے کا موقع ملتا تھا۔ طرح طرح کی نئی

بیماریاں، اور جنگ وغیرہ کتنے اسباب تھے جو ہمیشہ ان کے پاس مریضوں کی بھیڑ لگائے رہتے تھے۔ مجھے اس کا افسوس نہیں ہے اگر کسی زمانہ میں ایسا ہو کہ کوئی مریض نہ رہ جائے تو اور بھی اچھا ہوگا۔ مستقبل میں طب کی نشر و اشاعت بھی ختم ہو جائے تو بھی کوئی فکر کی بات نہیں لیکن ہاں اگر ایک طرف مریضوں کے علاج کا کام کم ہو گیا ہے تو دوسری طرف صحت کے متعلق مختلف اصولوں کے پروپیگنڈے کے لئے پورا وقت ملتا ہے۔ کھانا پہننا، رہنا، سہنا ان تمام باتوں میں صحت کو برقرار رکھنے کے اصولوں پر طریقوں پر اب زیادہ زور دیا جاتا ہے" یہ سب کام اب طبیبوں کے فرائض میں داخل ہیں مختصر یہ کہ علم طب اب پہلے کی طرح منفی نہ رہا بلکہ مثبت ہوتا جا رہا ہے۔

رحیم اور منورما نے اسپتال کی اچھی طرح سیر کرائی، مریضوں کے رہنے کھانے پینے اور انتظام کی خوبیوں کا کیا کہنا تھا۔ ہر طرف صفائی اور نفاست کی حکومت تھی۔ خدمتگار خاتونیں مریض کی آدھی تکلیف کو تو اپنے خوش اخلاق برتاؤ شیریں گفتگو اور ہمدردی سے دور کر دیتی تھیں۔ دواؤں کا ذخیرہ بہت بڑا تھا۔ استعمال کے اوزار اپنی اپنی جگہوں پر صفائی اور نفاست کے ساتھ رکھے تھے۔ اسپتال کے باورچی خانہ وغیرہ تمام چیزوں کا جائزہ لے کر ہم سب وہاں سے قیام گاہ کی طرف لوٹے۔ میں نے سوچا کل اور آج کی بہت سی باتیں مجھے روزنامچے میں درج کرنا ہے۔ ابھی ایک بجا ہے یہی کام کروں گا۔ شام کو آنے کا وعدہ کر کے اسمعیل اور پریم دوا تو چلے گئے لیکن دیو قیام گاہ پر پہنچا کر لوٹے۔ میں نے وشوامتر سے روزنامچہ لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ اپنے کمرہ میں چلے گئے اور میں لکھنے بیٹھ گیا۔ لکھنے کے قابل باتوں کا دماغ میں ہجوم تھا لیکن میرے پاس وقت کی کمی تھی اسلئے میں نے سوچا جہاں تک ہو سکے صرف خاص خاص باتوں کو مختصر طور پر درج کر دیا جائے اس خیال سے کہ کوئی خاص بات چھوٹنے نہ پائے میں نے طے کیا کہ دن بھر کی لکھنے کے لائق باتوں کو رات کے وقت سونے سے پہلے ضرور لکھ ڈالونگا۔

## باب ہفتم

# بچّوں کی دُنیا

دوسرے دن ہم "باغ طفلاں" کی طرف چلے۔ باغ کو آپ یہ نہ سمجھیں کہ کوئی چار دیواری یا لوہے کے سیخوں سے گھرا ہوا باغیچہ تھا۔ اس کی وہاں کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ نہ جانور ہیں جو اندر گھس کر نقصان کرینگے اور نہ کوئی چور۔ دروازہ بہت خوبصورت اور کشادہ تھا۔ سامنے دو محلہ مکان تھا۔ اندر جاتے ہی کامریڈ فاطمہ نے جو ہمارا انتظار کر رہی تھیں بڑھ کر خیر مقدم کیا۔ اگرچہ آپ کی عمر اسی سال کی ہے مگر اپنا کام جوان لڑکیوں کی طرح کرتی ہیں۔ آپ بیس سال سے بیوہ ہیں۔ تعلیم ختم کرکے شادی کرنے کے بعد آپ کے شوہر ہرنی کیس دویدی یہیں آکر بس گئے۔ دونوں میاں بیوی تکشیلا کے طالبعلم تھے۔ شوہر نے علاج کا کام اپنے اوپر لیا تھا۔ اور فاطمہ دس سال تک اسپتال میں مریضوں کی خدمت کا فرض ادا کرتی رہیں۔ آپ کا بال بچوں سے بہت گہرا پریم تھا اسی لئے بعد کو آپ باغ طفلاں میں چلی آئیں۔ اسوقت سے آپ ان بہشتی پھولوں کی خوشبو کا لطف اُٹھا رہی ہیں۔ نام سے آپ یہ نہ سمجھ جائیں کہ فاطمہ مسلمان ہیں۔ میں لکھ ہی چکا ہوں کہ مذہب اب اُٹھ گیا ہے۔

اب ہم لوگ آگے بڑھے باغ بہت وسیع اور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا پھول ہو جو وہاں نہ ہو۔ بیلا، چمیلی، مختلف اقسام کے گلاب، چمپا، جوہی، موگرا، کُند اور گیندا بھی موجود تھے۔ ان میں سے بہت سے پھول مسکرا رہے تھے اور بہت سے ہری پوشاک پہنے صرف تماشا دیکھ رہے تھے۔ درمیان میں بہت سے انار، نارنگی، سیب، آم

جامن، لیچی، کٹھل، بیر اور امرود وغیرہ کے درخت تھے۔ ٹٹیوں پر انگور کی لتر پھیلی ہوئی تھی۔ یہیں درمیان میں ایک پیپل کا درخت تھا جس کے تلے بچے گرمیوں میں کھیلتے تھے اگرچہ دھوپ نکل آئی تھی لیکن گھاسوں پر ابھی شبنم بے قرار تھی۔ اس لئے بچے ابھی اس بڑے پکے چبوترے ہی پر تھے جو اُن کی خواب گاہ کے سامنے تھا۔ دھوپ وہاں پہنچ چکی تھی اور اُنکی دیکھ بھال کرنے والی خاتونیں انھیں یہ بتلا رہی تھیں کہ آج اُن کو دیکھنے کے لئے بہت بزرگ ہستی آنے والی ہے۔ کوئی بڑا بچہ لیکن تین سال سے زیادہ کا نہیں (اس لئے کہ تین سال کے بعد وہ اسکول میں بھیج دیے جاتے تھے) پوچھ اُٹھتا تھا " اماں کیا وہ مہاتما ہماری بڑی امّاں سے بھی بوڑھے ہیں؟" وہ جواب دیتی " میرے بچے تمھاری بڑی امّاں کا اس وقت جنم بھی نہیں ہوا تھا۔ جب وہ بزرگ شخص امّاں سے بھی بوڑھے ہو گئے تھے۔"

ایک بچہ۔" تو آخر کس کے برابر ہیں۔" ہمارے گاؤں میں کسی کو بتاؤ۔"

ماں۔" تمھارے گاؤں میں کیا دنیا بھر میں کوئی اتنا بوڑھا نہیں ہے۔"

دوسرا بچہ۔" اچھا اس زمین پہ نہ سہی۔ مشتری کی زمین پر تو ہوگا، زہرہ کی زمین تو ہوگا۔"

ماں۔" ہوگا لیکن تم نے اسے دیکھا تو نہیں۔"

دوسرا بچہ۔" تو اسی زمین کو کہاں ہم نے سارا دیکھ لیا۔"

ماں۔" میرے پیارے۔ دیکھ لوگے ابھی تو چلنے کے لائق ہوئے ہو، ابھی تو بولنے کے لائق ہوئے ہو۔ جب دنیا کے قاعدے اور بول چال سیکھ لوگے تو سب دیکھ لوگے۔"

اتنے میں دوسری خاتون نے کہا " اب کیوں اتنا سر مغزنی کرتے ہو وجے۔ دیکھو وہ تمھاری بڑی امّاں کے بائیں طرف سفید ڈاڑھی والے وہ بزرگ آرہے ہیں۔ اپنا اپنا ستار ہاتھ میں لیلو آج دیکھنا ہے بوڑھے بابا کو کون اچھا گانا سناتا ہے۔ میں بھی سناؤنگی، جانکی اماں بھی سنائیگی زینب اماں بھی سنائیگی۔"

اتنے میں دھرو بول اُٹھا " میں بھی سناؤنگی" اس پر سب ہنس پڑیں جانکی نے

کہا "دھرو میں بھی سناؤں گی" "نہیں" "میں بھی سناؤں گا کہو" دھرو نے جانکی کے پاؤں سے لپٹ کر اور منہ ساڑی میں چھپا کر کہا "میں بھی سناؤں گا" اس پر روہنی نے کہا اوں "اماں میں بھی سناؤں گا؟" زینب نے کہا لو یہ دوسری آفت آئی روہنی ڈھائی سال کی بچی تھی۔ زینب نے اسے گود میں لے کر اور منہ چوم کر کہا "میری جیا لڑکیاں اس طرح نہیں بولتیں کہو۔ میں بھی سناؤں گی۔"

"ہوں! دھرو بھیا بھی تو یہی کہتا تھا کہ جانکی اماں نے ٹوکا"

زینب نے کہا "تو بیٹی ہے نا۔"

روہنی "ہاں تیری بیٹی ہوں۔ جانکی اماں کی بیٹی ہوں۔ تمری اماں کی بیٹی ہوں لیکن کمال بھیا کی تو بہن ہوں۔ دیکھئے شفیع بھیا بھی روہنی بہن روہنی بہن کہتا ہے۔ دھرو بھیا بھی بہن کہتا ہے۔ تو صرف بیٹی کیسے ہوں۔ بیٹی بھی ہوں اور بہن بھی ہوں۔"

زینب "اچھا بوڑھی دادی۔ تم بیٹی بھی ہو اور بہن بھی ہو لیکن بیٹا اور بھیا تو نہیں ہو۔"

روہنی "ہاں نہیں ہوں۔"

زینب۔ اچھا تو بیٹا اور بھیا سناؤں گا کہیں اور بیٹی اور بہن سناؤں گی کہیں۔ اتنا ہی نہیں بوڑھے بابا، ابا، چاچا۔ سناؤں گا کہیں اور بوڑھی اماں، چھوٹی اماں، بڑی اماں سناؤں گی کہیں۔ اتنے میں ہم لوگ پہنچ گئے اور بات یہیں ختم ہو گئی۔ "بلخ طفلاں" کی تمام ماؤں نے ہمارے خیر مقدم کے لئے پہلے ہاتھ اٹھایا۔ جسے دیکھ کر بچوں نے بھی ہاتھ اٹھایا سوائے ان بچوں کے جو چھوٹی گدیوں میں بیٹھے تھے۔ مجھے وہ بچے واقعی کھلے ہوئے بہشتی پھولوں کی طرح معلوم ہوتے۔ ان کے سرخ ہونٹوں اور گلابی گالوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ سب کے جسم پر ایک ہی قسم کے گلابی رنگ کے فلالین کا لباس تھا۔ سب کے پیروں میں چھوٹے چھوٹے موزے اور چھوٹے خوبصورت جوتے تھے۔ سر ملائم ٹوپی سے ڈھکا تھا۔ خیر مقدم کے بعد ہی تمام لڑکے اور لڑکیاں جن کی دراں شناخت مشکل تھی اپنے

چھوٹے چھوٹے تین تار والے کھلونے ستار کو لے کر بیٹھ گئے۔ کوئی بچہ مضراب کو اُٹھا پھنتا اور وہ انگلی میں نہیں جاتی تو پاس کے بڑے لڑکے سے کہتا۔ "موہن بھیا جلدی اسے انگلی میں لگا دے تو"

مرتضیٰ نے ایک بار کان کے پاس لے جا کر۔ تار پر انگلی ماری تو آواز پیدا ہوئی۔ بس کیا تھا اس نے سمجھا میں بازی مارے جاؤنگا۔ فوراً خوشی سے پھولا ہوا پریم ودا کے پاس دوڑ گیا۔ ہاتھ پکڑ کر اور تھوڑی دور لے جا کر بولا "اماں ذرا گودی تو لے"۔ جب گودی چڑھ گیا تو اپنے باجہ کو کان کے پاس لے جا کر ایک بار تار پر انگلی مارا لیکن اس دفعہ تار ہاتھ سے دب گیا تھا لہذا آواز نہ نکلی اسے بڑا تعجب ہوا۔ اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔ پھر بھی بولا "ماں ابھی نہیں۔ نہ سنا کھڑی رہ۔ سناتا ہوں نہ"۔

پریم ودا وجہ سمجھ گئی تھی اس نے تار پر سے انگلی ذرا کھسکا دی، مرتضیٰ نے اب کی جو انگلی ماری تو آواز آئی۔ خوش ہو کر بولا "دیکھو میں اچھا بجاتا ہوں نہ"۔

پریم ودا نے کہا "ہاں بیٹا، تو بڑا اچھا بجاتا ہے"۔ آج اس بزرگ شخص کو سنا تو"۔

اس پر مرتضیٰ نے پوچھا "وہ بزرگ شخص کون ہیں؟" پریم ودا نے بتایا "یہی بوڑھے بوڑھے سفید ڈاڑھی والے"۔ اب مرتضیٰ نے ایک بات چالاکی کی کہی۔ "میں اب چپ سے بیٹھ جاتا ہوں نہیں تو وجے بھیا کہے گا۔ اماں سے سیکھ آیا ہے"۔

یہ کہہ کر مرتضیٰ ایک جگہ بیٹھ گیا اور ایسی شکل بنا کر جیسے کوئی راگ الاپنے جا رہا ہے کچھ گنگناتے ہوئے، ستار چھیڑنے لگا۔ دیکھا دیکھی اور بچوں نے بھی ایسا ہی کرنا شروع کیا"۔ میں گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے بچوں کی طرف دیکھنے لگا۔ کوئی پاس ہی کھڑی ہوئی ماں کی انگلی پی رہا ہے کوئی آغوں آغوں کر رہا ہے۔ کوئی ہنس کر اپنی نئی دولت اگلے دانتوں کی نمائش کر رہا ہے۔ تمام بچے ہٹے کٹے اور تندرست تھے۔ کوئی

دُبلا بدصورت اور رونے والا نہ تھا۔ میں ایک چھ سات ماہ کے بچے کے پاس گیا تو اُس نے میرے ہاتھ بڑھاتے ہی اپنے ننھے ننھے ہاتھ بڑھا کر میری طرف آنے کی خواہش ظاہر کی۔ پھر کیا تھا۔ اس کو میری گود میں دیکھ کر بہت سے بچے باری باری سے گود میں چڑھے۔ سب بچوں کی تعداد ڈیڑھ سو تھی۔ دیر ہوتے دیکھ کر مرتضیٰ نے پریم ودا کے پاس جا کر کہا: "ماں اب سناؤں نا اب کیا دیر ہے؟" اس پر پریم ودا نے کہا "ہاں رہ جا ابھی اس بزرگ شخص کو بٹھاتی ہوں تب سُنانا" فاطمہ نے بیٹھنے کے لئے کہا۔ لڑکوں ہی کے درمیان ہمیں بیٹھنے کے لئے تھوڑی سی جگہ ملی۔ ہمارے بیٹھتے ہی سب بچے اور قریب قریب ہو گئے۔ "باغ طفلاں" میں سب ملا کر بیس مائیں تھیں سبھی اپنی اپنی گود میں اور آس پاس کے بچوں کو لے کر بیٹھ گئیں۔ ڈیڑھ سال کے اوپر والے بچوں نے ہاتھ میں ستار لے لیا تھا اور چھوٹوں میں سے کسی نے بلّی، کسی نے کتا، کسی نے خرگوش، کسی نے سیٹی، کسی نے گڑیا، کسی نے لکڑی کے حروف۔ اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ "بڑی اماں بولیں۔

"ساتھیو ہمارے والد بزرگوار (مراد میں) یہاں اپنے بچوں کو دیکھنے آئے ہیں۔ اب انھیں تم لوگ اپنا اپنا کمال دکھاؤ۔ والد بزرگوار بہت دنوں کے بعد آئے ہیں۔ پہلے جانکی اماں گانا سنائیں گی، اس کے بعد زینب اماں سنائیں گی اس کے بعد کون سنائے گا؟ وجے فوراً بول اُٹھا "میں"

مرتضیٰ پہلے سے بےچین تھا لیکن دھوکے میں آ کر نہ بول سکا۔ تو بھی جلدی جلدی اس نے کہہ ڈالا۔ "میں" جانکی نے ہاتھ میں وینا لے کر گیت گایا۔ گانے کا کہنا ہی کیا تھا۔ حالانکہ زبان بچوں کی تھی اور انداز بھی بچوں کا تھا لیکن سُر، طرز اور تان سب سے نرالا تھا۔ بیچ بیچ میں مَیں دیکھتا تھا کئی ایک بچے ستار کو ہاتھ سے چھیڑتے گنگناتے ہوئے تال لے رہے تھے۔ اب زینب نے وینا ہاتھ میں لیا۔ وجے اس کا شاگرد پاس بیٹھا تھا۔ ویسے بھی وہ چوکنا

بیٹھا تھا لیکن اب ایک بار کھڑا ہو کر اور آلتی پالتی مار کر ٹھیک زینب کی طرح اس کے داہنی طرف بیٹھ گیا۔ زینب نے میٹھے سر میں ایک گیت سنایا۔ گیت ختم ہوتے ہی جوں ہی زینب نے اپنی وینا الگ کی۔ وجے گود میں جا بیٹھا اور آہستہ سے کان میں بولا "ماں وہی اس دن والا گیت نہ سناؤں؟" زینب نے کہا۔ "کون سا" اس پر وجے کان میں کہہ "بُس پھسایا" زینب نے کہا۔ ہاں بیٹا وہی وہی" اب وجے آہستہ سے میرے پاس آیا اور بولا "والد بزرگوار۔ اب ایک گیت میں سناؤنگا" مرتضیٰ نے کہا۔ نہیں پہلے میں سناؤنگا تب وجے بھیا سنائیگا "وجے نے کہا نہیں پہلے میں نے کہا تھا پہلے میں سناؤنگا۔ مرتضیٰ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اب بڑی اماں نے جھگڑے کا جلدی فیصلہ ہوتے نہ دیکھ کر کہا۔" اچھا دونوں بھائی میرے پاس آؤ۔ دونوں دوڑ کر فاطمہ کی گود میں چلے گئے تب فاطمہ نے وجے سے پوچھا۔" وجے جب اس دن تم اور شفیع میرے پاس تھے میں سیب کا ٹکڑا جب تمھیں دینے لگی تو تم نے کیوں لینے سے انکار کیا؟" وجے کو اماں کے ہاتھ سے پھل کے انکار کا لفظ دُرشت معلوم ہوا۔ جھٹ گلے سے لپٹ کر کہنے لگا" اماں تو تو یوں ہی کہتی ہے۔ انکار تھوڑی ہی کیا تھا۔ میں نے تو کہا تھا کہ پہلے شفیع کو دے اس کے بعد مجھے" فاطمہ نے پوچھا" اچھا ایسا ہی کیوں کیا؟"

وجے نے جواب دیا" تم ہی نے تو بتایا تھا کہ پہلے چھوٹے بھائی کو دو تب خود کھاؤ۔ شفیع چھوٹا بھیا ہے اور میں بڑا بھیا ہوں۔ تو پہلے کیوں کھا جاتا۔ پرہلاد بھیا ابراہیم بھیا، جمشید بھیا جب اسکول نہیں گئے تب میرے یا شیام بھیا کے بغیر کھانا کہاں کھاتے تھے؟"

فاطمہ نے کہا" ہاں میرے لال! ٹھیک تو کہتا ہے۔ اچھا تو مرتضیٰ چھوٹا بھیا ہے یا بڑا بھیا؟"

وجے۔ "چھوٹا بھیّا!"

فاطمہ۔ "تو پھر اس کی بات پہلے مانی جائے یا تمھاری؟" وجے کو اپنی غلطی سمجھ میں آگئی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہاں مرتضےٰ پہلے تو گائے اس کے بعد میں گاؤں گا۔ بڑے بھیّا چھوٹے بھیّا" کی باتیں سُن کر مرتضیٰ کے دل نے بھی پلٹا کھایا۔ اس نے کہا۔ "وجے بڑا بھیّا ہے۔ پہلے وہ گائے گا اس کے بعد میں گاؤں گا۔"

وجے نے کہا۔ "مرتضیٰ چھوٹا بھیّا ہے۔ پہلے وہ گائیگا اس کے بعد میں" اب ایک نئی قسم کا جھگڑا کھڑا ہوتے دیکھ کر بڑی اماں نے کہا۔ "بڑے بھیّا کی بات چھوٹے بھیّا کو مان لینی چاہیئے نا!"

مرتضیٰ۔ "ہاں امّاں مان لینی چاہیئے"

فاطمہ۔ "تو پھر جیسا وجے بھیّا کہتا ہے ویسا کرو۔" اب مرتضیٰ دوڑ کر پریم ودا کے پاس گیا اور بولا۔ "امّاں میرے تاروں کو ٹھیک تو کردے۔" پریم ودا نے ستار لے کر تاروں کو ذرا ادھر ادھر کھینچ دیا۔ اب مرتضیٰ پالتی مار کر اور بائیں پاؤں کے سہارے ستار کو ہاتھ میں لے کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے تان سین ہی اُتر آیا ہو۔ تھوڑی دیر تاروں کو کھینچنے کھانچنے کے بعد بولا۔ "ابھی گیت میں نے نہیں سیکھا ہے صرف باجا بجاؤں گا" میں نے اور وشوامتر نے کہا "ہاں باجا ہی بجائیے" مرتضےٰ نے ایک بار انگلی تار پر ماری لیکن وہ تار تک نہ پہنچ سکی۔ بغل والے لڑکے ہنسنا ہی چاہتے تھے کہ اس نے پھر ایک بار خوب سنبھال کر انگلی ماری اور اب "ڈن" سی آواز آئی۔ پریم ودا، فاطمہ، میں نے اور تمام لوگوں نے اسے شاباشی دی۔ مرتضیٰ بہت مسرور ہوا اور بولا" اچھا اب وجے بھیّا کا گیت ہو" وجے جو اب تک بڑی اماں کے پاس بیٹھا تھا اٹھ کر زینب کے پاس جاکر بولا۔ "ماں تو ذرا بجا تو میں گاؤں"

وجے نے ایک وہ گیت خوب محنت سے یاد کئے تھے وہ زیادہ تر زینب کی گود میں جُھک کر

اس کے ستار بجانے پر گایا کرتا تھا۔ چنانچہ پھر اس نے ستار بجانے کو کہا۔ زیب نے یوں ہی ستار چھوڑ دوجے گانا شروع کیا۔ بچّے کے میٹھے سُر اور اس کے نازک گلے سے نکلے ہوئے دلکش گیت نے روح کو بے انتہا فرحت بخشا۔ کے بعد دیکھیے دو چار اور کوتوں نے اپنے ننھے کمالات کا تماشا دکھایا۔ اس کے بعد حروف کے کھلاڑیوں کی باری آئی۔ مریم اور رُکمنی سب سے پہلے سامنے آئیں۔ پریم وِدّا نے لکڑی کے حروف کے بکس کو ہاتھ میں لے کر اس میں سے ایک حرف نیچے رکھ کر کہا۔ "بوجھو یہ کیا ہے؟" رُکمنی کی بدقسمتی سے اس کی طرف حروف کی اوپری لکیر تھی جس سے جب تک وہ سوچے تب تک مریم بول اُٹھی "گ" اب مریم کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ پریم ودا نے کہا "بیٹی رکمنی کوئی پرواہ نہیں۔ آؤ تم دونوں ایک سیدھ میں کھڑے ہو کر اب کی بار بوجھو۔ اس دفعہ پریم ودا نے ایک حرف پھینکا جس کے گرتے ہوئے دونوں ایک ساتھ بول اُٹھیں "ر" بڑی اماں نے دونوں کو گلے سے لگا لیا۔ اب بڑی اماں سب کے کتے بلی، بطخ، گڑیاں وغیرہ کھلونوں کو لے کر اور ان کو ایک قطار میں سجا کر کہنے لگیں "پری ورت! خرگوش تو لے آؤ۔" پری ورت نے فوراً خرگوش اُٹھا کر ہاتھ میں دے دیا۔ اسی طرح وہ ایک ایک جانور کا نام لیتیں اور بچے اُنھیں لا لا کر دیتے جاتے تھے۔

اس کے بعد پوری جماعت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بالکل چھوٹے بچّے بھی اس تماشے میں شامل تھے۔ مائیں گود میں اُنھیں لیے تھیں۔ پھولوں کے پاس لیجا کر اس بات کا امتحان لیا گیا کہ کون کتنے پھل پھولوں کے نام جانتا ہے اور پہچانتا ہے۔ وہاں دُوسری کی ڈالیوں میں بہت سے پالنے لٹک رہے تھے جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ چھوٹے بچّے انھیں پر سوتے ہیں یا جھولتے رہتے ہیں۔ پالنوں کے گدے بہت ملائم تھے۔ ایک مشین سب جھولنوں کو آہستہ آہستہ جھلاتی رہتی

تھی۔ ہم لوگ یہ دیکھ ہی رہے تھے کہ نو کا گھنٹہ بجا۔ آج گھاس کے فرش پر کھانا کھانے
کا انتظام ہوا تھا۔ باہر سے بھی کئی عورتیں آتی نظر آئیں۔ یہ عورتیں بچوں کی اصل مائیں
تھیں۔ دراصل یہاں پر "ماں" کے لفظ سے ان تمام خواتین کو مخاطب کیا جاتا ہے جو
بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت کے کام پر مامور ہیں۔ ہر قسم کا فائدہ ہوتے دیکھکر
اصل مائیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو عموماً باغ طفلاں میں چھوڑ دیتی تھیں۔ رات
کے وقت سال بھر تک کے بچوں کو اصل مائیں اپنے پاس رکھتی تھیں۔ ان میں
نوزائیدہ بچوں والی مائیں اگر کام کرتی ہیں تو گاؤں میں ہی اور وہ بھی صرف دو گھنٹے
باقی وقت وہ "باغ طفلاں" میں بچوں کا دل بہلاتی ہیں۔ "باغ طفلاں" دراصل گاؤں
والوں کی تفریح گاہ تھا۔ جہاں پھولوں اور دل بہلانے کے دوسرے سامان کیساتھ
ساتھ نازک نازک بچے بھی تھے۔ ان کے شیریں گیتوں کے سننے اور ان کے دل
بہلانے والے کھیلوں کو دیکھنے کی خواہش بہت سے مرد و عورتوں کو اپنے فرصت
کے اوقات وہیں گذارنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

آج مقصد تو صرف یہ ہے کہ نسل انسانی کی زندگی کو خوشگوار بنایا جائے اور
اس سلسلے میں آج کے انسان کو کافی کامیابی بھی حاصل ہو چکی ہے۔ لیکن بچوں کے
لئے جو آرام و آسائش کی چیزیں مہیا کی گئی ہیں وہ قدیم زمانہ کے شہزادوں کو بھی
شاید نصیب نہ تھیں۔ عموماً بچوں کو تھوڑا تھوڑا کرکے دن رات میں ہر تین گھنٹے پر
سات بار ناشتہ اور کھانا دیا جاتا ہے۔ پہلا ناشتہ چھ بجے ہوتا ہے جس میں بچوں کو دودھ
کے ساتھ ستو کی مفید مٹھائیاں کھلائی جاتی ہیں۔ نو بجے کے لئے کچھ پھل، کھیر اور اسی
قسم کی اشیاء ہوتی ہیں۔ بارہ بجے دال چاول، روٹی، ترکاری کا انتظام رہتا ہے تین بجے
پھر پھل، دودھ پھر چھ بجے کچھ پھل اور دودھ، نو بجے نمکین اور میٹھی چیزوں کے ساتھ تھوڑا
سا دودھ اور بارہ بجے رات کو پھر دودھ اور کچھ پھل۔ کھانے کا سلسلہ تین تین گھنٹے پر جاری

ہوتا ہے۔ لیکن تین وقت یعنی صبح، دوپہر، اور رات کو نو بجے کے علاوہ پیٹ بھر نہیں کھلا دیا جاتا۔ کھانا ہضم کرنے کے لئے بچے دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ آنکھ مچولی وغیرہ اور پرانی قسم کے کھیل بھی کھیلے جاتے ہیں۔ مثلاً چھوٹے چھوٹے فٹ بال۔ ہری ہری گھاس پر ان ننھے جوانوں کا کبڈی کھیلنا بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ باغ میں ایک اکھاڑہ بھی لوٹ پلوٹ اور پہلوانی کے لئے ہے۔ غرضیکہ کھانا، لباس اور تعلیم و تربیت اور جسمانی ورزش تمام باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ہاں تو جن ماؤں کو میں نے ابھی آتے دیکھا تھا انہوں نے اپنے اپنے نوزائیدہ بچوں کو دودھ پلانا شروع کیا۔ اور ان میں سے بہت سی لڑکوں کے پاس بیٹھ گئیں اور ان کو کھلانے لگیں۔ کھانا کھا سکنے والے بچوں کی مائیں اپنے اور پرائے سب بچوں کو ساتھ لیکر یکساں برتاؤ سے کھلانے لگتی ہیں۔ دراصل اس وقت کے مرد و عورت کے دل سے تنگ خیالی اور اپنے پرائے کا خیال دور ہو گیا ہے ان کے دل کشادہ ہیں صرف بچوں کی اصلی ماؤں کو ہی نہیں بلکہ ان ماؤں کو بھی جو "باغ طفلاں" میں رات دن بچوں کی خدمت اور دیکھ بھال کرتی ہیں بچوں کا تین سال کے بعد دوسرے اسکولوں میں بھیج دیا جانا بہت شاق گزرتا ہے لیکن ملک کی بہبود کے لئے اور خود ان بچوں کی [illegible] طرح وہ سب کچھ برداشت کرتے ہیں۔

کھانا ختم ہونے کے بعد اب ہم لوگ کوٹھے پر "عجائب خانہ" دیکھنے چلے۔ کچھ بچے تو خود چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں سے اوپر چڑھ آئے اور کچھ کو ماؤں نے اوپر پہنچایا۔ وہ بچہ تمام بچوں میں ہوشیار تھا۔ اس کا جسم بھی ہٹا کٹا تھا۔ وہ زینب کی انگلی پکڑے ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔ عجائب خانہ میں داخل ہوتے ہی دیکھا۔ نیچے سینکڑوں قسم کی چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ تیر کمان، پھرسا، گنڈاسا، لاٹھی، بندوق، طپنچہ، بھالا، زرہ بکتر، اور خود، دیواروں پر لٹکے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی توپیں بھی رکھی ہیں۔ دیواروں کے اوپر بڑے بڑے رہنماؤں کے سوانح حیات کے متعلق چوڑے چکلے فریموں میں تصویریں

تصویریں ہیں۔ کہیں پر سقراط خوشی سے زہر کا پیالہ پی رہا ہے۔ کہیں مہاتما بدھ خون آلودہ انگلی کی تکلیف کی پرواہ کئے بغیر خوش و خرم کھڑے ہیں۔ کہیں گاندھی سڑک پر کنکر کوٹ رہے ہیں۔ کہیں ابراہیم لنکن دھمکیوں کی پرواہ کئے بغیر انسان کو غلامی سے سے نجات دلانے کے لئے قربانی کر رہا ہے کہیں جون آف آرک آزادی کی خاطر جان نچھاور کر رہی ہے۔ کہیں جنگ کے بعد سامراج سے لوگ متنفر ہو رہے ہیں۔ اسی طرح مختلف قسم کی تصویریں دیوار سے آویزاں تھیں۔

مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ بچوں کو بولتے فلم کے ذریعہ بھی بہت سی تاریخی اور علمی باتیں بتائی جاتی ہیں۔ گرہن کی وجہ۔ رات اور دن کا ہونا۔ چاند کا گھٹنا، بڑھنا وغیرہ بھی بتایا جاتا ہے۔ بچوں کو یہ ساری تعلیم دل بہلا دے اور کھیل کی شکل میں دے دی جاتی ہے۔ معلموں کا کام صرف یہ ہے کہ وہ بچوں کی حیرت کو اُکسانے والی اشیاء جمع کردیں جب ایک بار احساس حیرت جاگ اُٹھتا ہے تو اس کی تسکین کے لئے بچہ سب کچھ برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس وقت ہر بات اسے جلد سمجھ میں بھی آتی ہے اور یاد بھی رہتی ہے۔ علم کو گھول کر پلانے یا دماغ میں ٹھونسنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں نے چیزوں کو دیکھتے وقت درمیان میں جب ایک لڑکے سے ایک چیز کا نام پوچھا یا نام لے کر چیز دکھانے کو کہا تو بچہ نے بڑی خوشی اور اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔ فاطمہ نے بتایا۔ بچے خود انگلی پکڑ کر ماؤں کو کھینچ لاتے ہیں۔ کبھی کسی چیز کا نام پوچھتے ہیں۔ کبھی کسی تصویر کو دیکھ کر اس کی کہانی سنانے کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ کہنے والے سے زیادہ بچوں کو انھیں دیکھنے اور سننے میں مزا آتا ہے۔ اس وقت اگر کبھی کھانے کا وقت آگیا تو بچوں کو بہت برا معلوم ہوتا ہے اور وہ بہت مچلتے ہوئے وہاں سے اُٹھتے ہیں۔ تین سال تک ان کو کوئی کتاب پڑھنے کو نہیں دی جاتی نہ لکھنے لکھانے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ لیکن معلومات کے ساتھ ساتھ بہت سے ہندسے اور حروف کا علم انھیں

کھیلتے ہی کھیلتے ہو جاتا ہے۔ قطب شمالی اور ہفت سیارے وغیرہ کئی تاروں کی وہ شناخت کرنے لگتے ہیں۔ ان کے معلومات کے ذخیرہ میں بے شمار اشیار کے نام آجاتے ہیں۔ ماں باپ اور بچوں کو پیار کرنے والیوں کی گفتگو سے اس کے علاوہ وہاں کے ماحول میں خالص زبان کا استعمال ہونے کی وجہ سے انکی زبان بھی بہت صاف ستھری اور سلیس ہو جاتی ہے۔

کوٹھے پر سے اُترنے کے بعد ہم سب بچوں کی خواب گاہ کی طرف مڑے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے پالنے آویزاں ہیں۔ بچوں کے سونے کے لئے پلنگ پر عمدہ قسم کے ملائم گدے بچھے ہیں۔ سردی میں کمرہ کو گرم کرنے کا پورا انتظام ہے۔ رات کے وقت بہت کم بچے یہاں رہ جاتے ہیں۔ زیادہ تر اپنی اصلی ماؤں کے پاس سوتے ہیں۔ جو تھوڑے بہت رہ جاتے ہیں وہ اپنے باغ کی ماؤں کی گود میں سوتے ہیں۔ خواب گاہ کے بغل میں کمرۂ طعام ہے۔ بغل میں باورچی خانہ ہے جہاں بچوں کے لئے تازہ کھانا تیار ہوتا رہتا ہے۔ اب گیارہ کا وقت نزدیک آرہا تھا۔ لہذا باغ کی زیادہ سیر نہ ہو سکی دیوار سے چھوٹی چھوٹی چھتریوں کے نیچے کچھ مجسمے سے دکھائی پڑے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں ان بڑی بڑی تاریخی ہستیوں کے مجسمے ہیں جن کی بچے قدر و منزلت کرتے ہیں بچے وہاں پہنچتے ہی ان کے حالات جاننے کی ضد کرتے ہیں۔ بغیر کسی بزرگ ہستی سے متعلق ایک دو باتیں سنے چین نہیں لیتے۔

جانکی نے گھڑی دیکھ کر بتایا کہ اب گیارہ میں پانچ منٹ باقی ہیں۔ ہم لوگ "باغ طفلاں" سے رخصت ہوئے۔

اس روز اتنا ہی دیکھنے کا پروگرام تھا۔ دوسرے روز وہاں سے نالندہ کی روانگی تھی۔ قیام گاہ پر واپس آنے کے بعد وشوامتر کے ساتھ سفر کے اوقات اور راستہ کی باتوں پر غور کرتا رہا۔

وشوامتر نے پوچھا۔ "کیا ہم یہیں سے سیدھے نالندہ چلیں گے؟"

"سیدھے تو چلنا ہوگا لیکن اسکے یہ معنی ہونے چاہئیں کہ درمیان میں کہیں اترنا نہ پڑے"

"ریل سے چلنے میں وقت کچھ زیادہ لگے گا۔ اگر ہوائی جہاز سے چلنا ہو آدھ گھنٹہ کا راستہ ہے۔"

"اتنی جلدی چلنا بھی مناسب نہیں ہے۔ ریل سے چلنا زیادہ اچھا ہے اور اس میں بھی اس ریل سے جو اکسپریس نہ ہو تاکہ ہر اسٹیشن پر رکتے چلیں اور جانا بھی اسی لائن سے چاہئے جس سے میں سفر کرتا تھا۔ کیونکہ میں راستہ میں آس پاس کی بستیوں کی تنظیم کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اب اس طرف جلدی تو آنا نہیں ہے اس لئے میری رائے ہے کہ یہاں سے رکسول، سگولی، موتی ہاری، مظفر پور، پٹنہ اور بختیار پور ہوتے ہوئے نالندہ چلیں لیکن راستہ میں کہیں قیام نہیں کرنا ہے۔ صرف جہاں گاڑی بدلے وہاں محض اتنی دیر کے لئے اُترنا ہے جتنی دیر گاڑی بدلنے میں صرف ہو۔"

"گاڑی بھی پٹنہ ہی میں بدلے گی۔ بختیار پور جانے کی ضرورت نہیں۔ پٹنہ سے سیدھے نالندہ کو لائن گئی ہے۔ ریلوے لائنوں میں بھی بڑی تبدیلی ہو گئی ہے۔ اب ہندوستان میں کیا ساری دنیا کی لائنوں کی چوڑائی ایک ہی ہے۔ یہ چوڑائی آپ کے زمانے کی ای۔ آئی آر کی چوڑائی سے کم ہے۔ اب بی۔ این۔ ڈبلیو ریلوے کی چھوٹی لائن اور بختیار پور، بہار والا 'ریل کا بچہ' بھی نہیں ملے گا۔"

"دشواتر! ریل کا بچہ تم نے کیسے جانا؟"

"کتابوں سے"

"لیکن اس کے متعلق قصہ تمہیں نہ معلوم ہو گا۔ سنو! تم تو تاریخ کے عالم ہو، اس زمانہ کے لوگوں میں جہالت بہت تھی۔ بہت سے لوگ اپنا خط دوسرے گاؤں میں پڑھوانے جاتے تھے۔ جب مرد ہی حرف سے ناآشنا تھے تو عورتوں کا کیا پوچھنا ہے۔ کوئی دیہاتی بختیار پور کی اُس زمانہ کی بڑی لائن کی گاڑی پر سوار تھا۔ اس نے اسٹیشن کے دوسری طرف ریل کے چھوٹے چھوٹے ڈبے دیکھے جو بڑے بڑے ڈبوں کے سامنے اسطرح معلوم ہوتے تھے جیسے باپ کے سامنے اسکا چھوٹا بچہ، اس نے اتنی چھوٹی ریل گاڑی اب تک نہ دیکھی تھی۔ اپنے

قریب کے آدمی سے پوچھا جو خود بھی جاہل لیکن خوش حال تھا۔ "یہ کیا ہے؟" جواب ملا "ریل کا بچہ"
پہلے نے پوچھا "ریل بھی بچہ دیتی ہے"۔
"دیکھ ہی رہے ہو، ہاتھی کا بچہ ہاتھی نہیں دیکھا ہے؟"
اس نے کہا۔ "ہاں سچ کہتے ہو بالکل شکل وصورت بھی ملتی ہے۔" صرف چھوٹائی بڑائی کا فرق ہے۔" اچھا تو اب بیچارہ ریل کا بچہ بھی معدوم ہوگیا اور اس کے بولنے والے بھی۔ پٹنہ تک جب گاڑی نہیں بدلے گی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ گنگا پر پل بن گیا ہوگا۔"
"سن ۱۹۵۵ء ہی میں بن گیا۔"
"اچھا تو کل کس وقت چلنا چاہیئے؟"
"کل ساتھی اسمٰعیل سے باتیں ہوئی تھیں۔ وہ کہہ رہے تھے موہن پورہ اسٹیشن پر ریل پر چڑھنا ہے۔ وہاں والے بھی آپ سے ملنے کے لئے بہت بے چین ہیں۔ ان کا اصرار تو ایک رات کے قیام کا بھی تھا۔ لیکن آپ کی خواہش میں وہ مخل ہونا نہیں چاہتے۔ کل ناشتے کے بعد یہاں والوں سے رخصت ہو کر آٹھ بجے چلنا چاہیئے۔ ساڑھے آٹھ بجے وہاں پہنچ جائینگے گیارہ بجے کھانا کھا کر وہاں سے بارہ بجے ریل پر سوار ہونا ہے۔"
"ٹھیک ہے۔"
وشوامتر نے یہ باتیں ساتھی اسمٰعیل کے گوش گذار کر دیں اور اس کی خبر اُسی دن موہن پور اور دور میان کے اسٹیشنوں اور نالندہ کو بھیج دی گئی تھی۔ ٹائم ٹیبل دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ ہمیں اُس وقت پسنجر پر سوار ہونا ہے جو ہر اسٹیشن پر رُکتی ہے۔ ہم لوگ اس طرح پرسوں سویرے ساڑھے چھ بجے نالندہ پہنچ جائیں گے۔

## باب ہشتم

# ریل کا سفر

آج ناشتہ سے پہلے میری قیام گاہ پر پریم ددا اور اسمعیل کے علاوہ دیومتر، پروفیسر وشوامتر وغیرہ کئی لوگ آ گئے تھے۔ ہم لوگ ساتھ ہی طعام گاہ گئے، ٹاؤن ہال میں گاؤں کی طرف سے جلسۂ رخصت کا انتظام کیا گیا تھا۔ ناشتہ کے بعد ہم لوگ ٹاؤن ہال پہنچے۔ وہاں تمام لوگوں کی طرف سے دیومتر جی نے میرے لئے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی مجھے آٹھ دھاتوں کے کاغذ پر سونے کے حروف میں لکھی ہوئی ایک نظم بطور تہنیت پیش کی۔ اس نظم کی خالق پریم ددا تھیں۔ میں نے جواب میں گاؤں والوں کے جوش محبت کا شکریہ ادا کیا۔

اب تمام لوگوں کی محبت آمیز تقریروں کے بعد سیب گاؤں سے میں اور وشوامتر رخصت ہوئے۔ ہمارے ساتھ کار میں اسمعیل اور ان کی بیوی اور دیومتر بھی بیٹھے۔ ہمارے یہاں سے روانہ ہونے کی اطلاع فون کے ذریعہ موہن پور پہنچ گئی تھی۔

گاؤں کے باہر صدر صاحب، اور کئی مردوں اور عورتوں نے میرا خیر مقدم کیا اور یہ اطلاع دی کہ گاؤں والے ٹاؤن ہال میں انتظار کر رہے ہیں۔ ہم سب کار سے سیدھے ٹاؤن ہال پہنچے۔ مکانوں کا طرز سیب گاؤں کے مکانات کا سا تھا۔ بلکہ دیکھنے والوں کو دھوکہ ہو سکتا تھا کہ یہ وہی گاؤں ہے۔ وشوامتر نے بتایا فرق صرف لوگوں کی تعداد میں اور گاؤں کے رقبہ میں ہے، عمارتوں، سڑکوں اور ٹاؤن ہال وغیرہ کا نقشہ ملک بھر کے گاؤں کا ایک ہی ہے آب و ہوا کے خیال سے البتہ اس نقشہ میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔

موہن پور کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ یہاں کی آبادی بھی اتنی ہی ہے جتنی سیب گاؤں کی

یہاں برف بنانے کا ایک کارخانہ ہے، دوسرے آس پاس کے چودہ پندرہ پھل والے گاؤں کے میوہ جات مختلف مقامات پر یہیں سے چالان ہوتے ہیں یہاں کے پہاڑوں کے پھل لنکا اور برما تک جاتے ہیں۔ اتنے فاصلہ کے اثرات سے پھلوں کو محفوظ رکھنے کے لئے گاڑیوں میں چاروں طرف برف رکھی جاتی ہے۔ پھلوں کو لاد کر لے جانے والی لاریوں میں خاص پھلوں کے لیے لوہے کے بڑے بڑے جالی دار برتن ہوتے ہیں۔ ایک لاری پر اس قسم کا ایک ہی برتن ہوتا ہے۔ اوپر کے پھلوں کے بوجھ سے نیچے والے پھلوں کو بچانے کے لئے ایک ہی برتن میں کئی جالی دار خانے ہوتے ہیں۔ لاریوں کے اسٹیشن پر پہنچتے ہی کرین کے ذریعہ پورا برتن اٹھا کر ریل کے ڈبے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ ریل کے ڈبہ کا ناپ ایسا ہوتا ہے کہ پانچ لاریوں کے مال اس میں ٹھیک آجاتے ہیں۔ پھلوں کا شمار کرنا باغ والوں کا کام ہے۔ انتظام ایسا ہے کہ کولمبو (لنکا) جانے والے سیب ایک ہی گاڑی میں موہن پور سے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ درمیان میں گاڑی بدلنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

کار سے اُتر کر ٹاؤن ہال کے کمرۂ تفریح میں پہنچنے کے بعد موہن پور کے لوگوں نے میرا اسی طرح پرخلوص خیر مقدم کیا۔ جس طرح سیب گاؤں والوں نے کیا تھا۔ گاؤں کے صدر نے میرے متعلق گاؤں والوں کی طرف سے اپنے پُرخلوص جذبات کا اظہار کیا میں نے شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد مجھے پھولوں کا ہار پہنایا گیا۔ کھانے کا وقت ہوگیا تھا اس لئے ہم سب نے طعام گاہ پر جاکر کھانا کھایا۔ ہر طرف محبت اور خوشی کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ وقت کی کمی کے سبب یہاں کے اور مقامات کی سیر نہیں کر سکا۔ یہاں کے ٹاؤن ہال اور طعام گاہ بھی بالکل ویسے ہی تھے جیسے سیب گاؤں کے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ "باغ طفلاں" اور اسپتال بھی ویسے ہی ہیں۔ دروازہ بھی ندی کی طرف ہے اور اسپتال سے تھوڑا سا ہٹ کر برف کا کارخانہ ہے۔ یہ باتیں اسٹیشن جاتے ہوئے معلوم

ہوئیں۔ میں نے بار بار کا خانے کی طرف اس خیال سے دیکھا کہ شاید چمنی نظر آجائے لیکن مجھے یہ یاد نہیں تھا کہ سب کام اب بجلی سے ہوتا ہے۔ چمنی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

ہم اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ پہلے ہی سے معلوم تھا کہ گاڑی کے آنے میں دو منٹ کی دیر ہے لہٰذا ہم لوگ تھوڑی دیر مہمان گاہ میں بیٹھ گئے کیوں کہ وشوامتر نے بتایا تھا کہ اب اسٹیشنوں پر نہ تو پانی، بیڑی، سگریٹ کی چیخ سنائی دیتی ہے اور نہ مٹھائیوں کی دوکانیں ہیں۔ نہ "قلی قلی" کا شور وغل۔ نہ مسافر خانوں کی بھیڑ ہے اور نہ بھک منگوں کی "خدا بھلا کرے" کی صدا گونجتی ہے۔ میں نے دریافت کیا "خیر اور نہ سہی لیکن مسافر خانوں کے بغیر تو مسافروں کو ضرور تکلیف ہوتی ہوگی؟" وشوامتر نے کہا "تکلیف کس بات کی خواہ مخواہ تو کوئی اُترتا نہیں۔ جسکو جہاں جانا ہوتا ہے وہ وہیں اُترتا ہے۔ بستر اور سامان کا کوئی بکھیڑا نہیں۔ اگر منزل مقصود قریب ہی ہے تو مہمان گاہ میں پیدل ہی پہنچ جاتے ہیں ورنہ فون پر دو لفظ بول دینے سے کار آجاتی ہے۔

آخر گاڑی بھی آگئی۔ آج پوری دو صدیوں کے بعد ریل کی شکل دیکھنے میں آئی تھی۔ لائن تو بڑی لائن کی طرح تھی۔ ڈبے بھی بہت خوبصورت اور رنگے ہوئے تھے۔ نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ انجن کا شناخت کرنا مشکل تھا۔ نہ تو دھوئیں کا بھک بھک تھا اور نہ کالی مائی کے رہنے کا اوندھا "ہودہ" انجن کے آگے کا حصہ ہوا کے دھکے کو کم کرنے کے لئے نوکدار بنائی گئی تھی۔ انجن کی دوسری پرانی تفصیلات بھی معدوم تھیں یہ کایا پلٹ بجلی کی وجہ سے تھی۔ اب کوئلہ پانی سے بھاپ پیدا کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ بجلی کی طاقت اندر موجود رہتی ہے۔ بجلی کا کچھ ذخیرہ باہر سے لاکر جمع کیا جاتا ہے اور اس کے بعد خود ریل کے پہیوں سے پیدا ہونے والی بجلی کام میں لائی جاتی ہے۔ آج کل کی دنیا میں اقتصادیات کے مسئلوں پر بحث کے سلسلے میں جہاں بال کی کھال نکالی جاتی ہے وہاں کارآمد چیزوں کو برباد ہونے نہیں دیا جاتا۔ مجال کیا جو سڑے گلے لوہے کا ایک ٹکڑا

ایک ذرا سا شیشہ کا ٹوٹا پھوٹا ٹکڑہ، ایک معمولی چیتھڑہ، ایک ردّی کاغذ کی چٹ بیکار پھینک دی جائے۔ تمام چیزیں گاؤں کے گودام میں جمع ہوتی رہتی ہیں۔ بعد میں وہاں سے ان کا استعمال کرنے والے کارخانوں میں بھیج دی جاتی ہیں۔ ہاں تو ریل کے انجن میں سے باہر برائے نام تعداد میں بجلی لینی پڑتی ہے اور پہیوں سے پیدا ہونے والی بجلی ہی گاڑی کو حرکت دینے، پنکھا، روشنی اور باورچی خانہ کو جاری رکھنے، کمرہ گرم رکھنے اور غسل کے لئے پانی گرم کرنے کے کاموں کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اسٹیشن پر نہ تو ٹکٹ گھر کے سامنے آدمیوں کا ہجوم ہوتا ہے اور نہ پولیس کی پھٹکار سنائی دیتی ہے۔ پولیس کے متعلق صرف اتنا معلوم ہوا کہ گاؤں کی پنچایت کے چناؤ کے ساتھ کچھ لوگ اس کام کے لئے بھی چن لئے جاتے ہیں۔ چوری وغیرہ کا ڈر نہیں پھر ایسی تہذیب یافتہ سوسائٹی میں بلا جبہ مارپیٹ وغیرہ پر کوئی نہیں اترتا لیکن اگر کوئی واقعہ ہوگیا یا کسی مجرم کو پکڑنا یا لے جانا ہوا تو اس وقت یہ کام انھیں کو کرنا پڑتا ہے۔ دراصل انکو پولیس نہ کہنا چاہئے بلکہ ان کے لئے خدمت گار کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔ اس لئے کہ وہ بہت خاکساری اور عاجزی سے پیش آتے ہیں اور ہمیشہ خدمت پر مستعد رہتے ہیں۔ ریلوں میں چڑھنے کے لئے ٹکٹ کی ضرورت باقی نہیں رہی اس لئے ٹکٹ بابو اور ٹکٹ کلکٹر کی قسم کی چیزیں اب معدوم ہیں۔ ہر مقام پر تار والے ٹیلیفون یا ریڈیو ٹیلیفون کے ذریعہ پیغام بھیجا جاتا ہے اس لئے "کوٹر اٹرا" کرنے والے بابوؤں کا بھی وجود نہیں۔ وقت پر لائن صاف رکھنے اور انتظام کرنے کے لئے مختلف کارکن مقرر ہیں۔ لیکن خلاصی، پوائنٹ مین اور اسٹیشن ماسٹر سب کا درجہ برابر ہے۔ بلکہ سب ایک دوسرے کا کام بھی کرسکتے ہیں۔ کاروبار کے لئے یہ کہنے کی ضرورت شاید نہیں کہ اب تمام کام ہندوستانی زبان میں ہوتا ہے۔ مچھلوں کے چالان کا ایک ہی مرکز ہے اس لئے یہاں چڑھانے، اتارنے اور ڈھونے کا کام زیادہ ہوتا ہے۔ مشینی عہد کے اس شباب میں سب کام ان مشینوں ہی کے ذریعہ ہوتا

ہے جن کی رگوں میں بجلی کا خون رواں دواں ہے۔ انسان صرف حکم دیتا ہے۔ پسنجر کے پلیٹ فارم سے کچھ دور، پرال گودام واقع تھا جس کے پاس ہی پیچھے کی طرف برف کا کارخانہ تھا۔ پلیٹ فارم بہت خوبصورت اور چکنا تھا اور آس پاس کی زمین میں پھولوں کی کیاریاں تھیں گاڑی کے آتے ہی ہم لوگ سوار ہو گئے۔ نہ میرے پاس کوئی بستر تھا اور نہ وشوامتر کے پاس، اور بھی بہت سے آدمیوں کو سوار ہوتے دیکھا۔ لیکن اب معلوم ہوتا تھا کہ سبھوں نے سامان ساتھ لے کر چلنے کی قسم کھائی ہے۔ کسی کے پاس بھی جسم پر کے علاوہ کوئی کپڑا نہیں تھا۔ نہ اوڑھنا، نہ بچھونا، نہ تکیہ، نہ ٹرنک، نہ لوٹا، گلاس، تھالی یا تسلہ اور نہ حقہ چلم تمباکو۔ چائے گرم، کباب روٹی، دانت کا منجن، سوڈا واٹر، برف وغیرہ کی مانوس آوازیں معلوم تھیں۔ گاڑی کیا تھی۔ چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں والے جگمگاتے ہوئے مکان تھے۔ فرسٹ سکنڈ اور تھرڈ کلاس کی کوئی تفریق نہ تھی۔ ایک ہی قسم کی گاڑی، ایک ہی قسم کا گدا چاہے اسے فرسٹ کلاس کہئے یا تھرڈ کلاس۔ دروازے دور دور پر واقع تھے۔ ہم لوگ انجن کے پاس ہی والے ڈبے میں چڑھ گئے۔ اب گاڑی چھوٹنے والی تھی اس لئے پریم دوا، اُٹیل، دیو متر اور سوہن پور کے تمام لوگ رخصت ہوئے۔ انجن چلانے والے شخص کو میرے پہنچنے کی خبر ہو گئی تھی۔ اس نے سیٹی دے کر گاڑی چھوڑ دی میں کھڑا ہو گیا۔ اور گاڑی کے اندرونی حصہ کا جائزہ لینے لگا۔ گاڑی کے ایک ہی طرف یہاں سے وہاں تک آنے جانے کیلئے راستہ بنا ہوا تھا اور اس کے دوسری طرف سونے کے لئے بنچیں تھیں جن پر لائم گدے بچھے تھے۔ میں نے وشوامتر سے کہا "پہلے اس بڈھے کو اپنی نئی دنیا کی گاڑی اچھی طرح دیکھ لینے دو۔ ہم لوگ انجن کے پاس سے چلے۔ جس ڈبے میں جاتے وہاں خیر مقدم ہوتا۔ مرد و عورت سب اپنی اپنی بنچوں پر بیٹھے تھے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ کوئی آج کا تازہ اخبار۔ اخباروں کی دھوم اب بھی کم نہیں۔ لیکن آج کل کے اخبارات میں بینک اور کمپنیوں کے اشتہار نہیں ہیں۔ "جو چاہو سو پوچھ لو" "ماضی حال اور مستقبل کی باتیں

معلوم کر لیجئے" "اصلی ہیرہ۔ فائدہ نہ کرے تو دام واپس" "گھر بیٹھے ایک ہزار روپیہ مہینہ کماؤ" "مفت، مفت، مفت" اس قسم کے اشتہارات کا نام ونشان بھی نہیں۔ اخبار والوں کی لکھی ہوئی بڑی بڑی بے کار سُرخیاں بھی نہیں۔ نہ "نامہ نگار خصوصی" اور نہ "بذریعہ رائٹر" کا پتہ ہے۔ خبروں کی سُرخیاں ضرور ہوتی ہیں لیکن اب سطحی چمک، دمک کی نمائش کرکے گاہکوں کی تعداد بڑھانے کا سوال ہی نہیں۔ اخباروں کا سائز بھی اب بھاری بھرکم اور اوڑھنے پہننے کے لائق نہیں رہا۔ خیال انگیز موضوعات پر مضامین اور مقالے ماہانہ رسالوں میں شائع ہوتے ہیں۔ روزنامے صرف دنیا کی روزانہ کی خبروں کو مختصر طور پر پیش کردیتے ہیں یہ ہر ایک صوبہ کے خاص شہر سے اُسی شہر کے نام سے چھپتے ہیں۔ شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ضرورت کے اعتبار سے اخبارات مختلف مقامات پر اتنی ہی تعداد میں بھیجے جاتے ہیں جتنے اس مقام کے تمام مرد وعورتیں کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ جب یہ اخبار پرانے ہوجاتے ہیں تو کاغذ کے کارخانے میں بھیج دئے جاتے ہیں جہاں ان کے حروف کو مٹاکر پھر انھیں کام میں لایا جاتا ہے۔ ماہنامے بہت دلکش اور تصویروں سے سجے سجائے ہوتے ہیں۔ فوٹوگرافی کے فن کا بھی یہ عہد شباب ہے۔ نہ صرف یہ کہ تصویر کے ساتھ اس کا رنگ بھی ہوبہو اتر آتا ہے بلکہ اب تصویریں ایک سکنڈ میں ٹیلی وژن کے ذریعہ دنیا کے دوسرے مقامات پر جوں کی توں اخباروں کے صفحوں پر اُتر آتی ہیں۔ میں جس دن سیب گاؤں کے باغ میں آیا اسی دن میری تصویر دنیا بھر کے اخباروں میں چھپ گئی تھی۔ سائنس کی ہر شاخ کا علیحدہ علیحدہ ماہنامہ نکلتا ہے۔

ہم لوگ اب ریل گاڑی کے کتب خانہ میں پہونچ گئے تھے۔ یہاں رسالے اور چھوٹے چھوٹے پمفلٹ کا ڈھیر لگا تھا۔ دو تین الماریاں کتابوں کی بھی تھیں لیکن اخباروں اور رسالوں کی تعداد زیادہ تھی۔ علم نجوم، ریاضیات، روحانیات، تاریخ اور لسانیات، سائکالوجی فلسفہ، ادبیات، بجلی، زراعت، طب، علم نباتات، علم الحیوانات وغیرہ علوم پر دنیا کے

مختلف حصوں سے نکلنے والے رسالے وہاں موجود تھے۔ مرد و عورت کہیں کسی فلسفیانہ مسئلہ پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے کہیں نئی خبروں پر خوشی یا رنج کا اظہار کر رہے تھے کہیں لوگ ادبی کتابوں سے دلچسپی لے رہے تھے۔ تو کہیں ناول ہی پڑھ یا سُن رہے تھے۔ کہیں گانے بجانے والوں کا مجمع تھا۔ کتابوں اور رسالوں کے ڈبے کے بعد ہی طعام گاہ ہے۔ مسافروں کو گھر کی طرح یہاں بنا بنایا کھانا ملتا ہے۔ کھانے کا وقت مسافروں کا بھی وہی ہے۔ گھنٹہ بجتے ہی لوگ تیار ہو کر بنچوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ طعام خانہ سے لکڑی کے تختہ پر کھانے کی چیزیں بجلی کے ذریعہ سرکتی ہوئی وہاں پہنچ جاتی ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد سب تختے بجلی ہی کے ذریعہ لوٹ جاتے ہیں۔ پانی پینے اور نہانے کے نل جگہ جگہ لگے ہیں۔ پاخانوں کا انتظام گاڑی کے آخری حصہ میں ہے۔ یہ بھی بڑے صاف ہیں لیکن پہلے کی ریلوں کی طرح جہاں تہاں لائن پر پاخانہ گرنے نہیں پاتا بلکہ وہ جمع ہوتا رہتا ہے اور خاص اسٹیشنوں میں پر پاخانہ کے نلوں میں گرا دیا جاتا ہے۔ صاف کرنے کے لئے پانی اور کیمیائی [illegible] موجود رہتا ہے

طعام خانہ کے کمرہ سے گذرتے ہوئے ہم لوگ آگے چلے۔ بہت سے لوگ بیٹھنے کیلئے اصرار کرتے تھے لیکن میں یہ کہہ دیتا تھا۔ "ذرا آپ کے زمانہ کی گاڑی تو اچھی طرح دیکھ لوں،" آگے ایک ڈبہ خاص مریضوں کے لئے تھا۔ اس میں پانچ چھ مریض بڑے آرام سے لیٹے تھے۔ ان کی خدمت کے لئے نرم و نازک اور ملائمت سے پیش آنے والی نرسیں مامور تھیں۔ کوئی کسی کو کتاب پڑھ کر سنا رہی تھی۔ کوئی گفتگو سے دل بہلا رہی تھی۔ پاس کی میز پر گرم رہنے والے برتنوں میں دودھ اور اس کے قریب ہی سیب انگور اور دوسرے تازہ پھل خوبصورتی سے سجا کر رکھے ہوئے تھے۔ ان مریضوں میں سے دو تبت سے آ رہے تھے۔ زیادہ عرصہ تک بیمار رہنے کی وجہ سے ان کے مزید علاج کے لئے انھیں کلکتہ لیجایا جا رہا تھا۔ تین اور مریض نیپال کی مختلف جگہوں کے تھے۔ انھیں ویدوں نے بحری سفر کی رائے دی تھی۔ علاج اور تیمارداری کا مناسب انتظام ہونے سے مریض کی آدھی تکلیف تو ویسے

ہی دور ہو گئی تھی۔ یہ آرام و آسائش گذشتہ زمانہ میں بڑے بڑے دولت مندوں کو بھی شاذ و نادر ہی نصیب ہو سکتی تھی اور غریب طبقہ کا تو پوچھنا ہی کیا۔

تمام ڈبوں کی سیر کر کے ہم لوگ ایک جگہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ اسوقت مجھے خیال آیا کہ ایک یہ زمانہ ہے اور ایک وہ بھی زمانہ تھا جب دنیا میں سخت سے سخت محنت کرنے والوں ہی کو سب سے زیادہ تکلیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بیچارے محنتی کسان مزدور ریل گاڑی میں جب پڑھتے تو ان کے لئے کھڑے ہونے کی جگہ نہ تھی لوگ ایک پر ایک بھیڑوں کی طرح جون جولائی کی سخت گرمی میں گرتے تھے اور ایک تنگ سی جگہ میں ٹھونس دئے جاتے تھے۔ اس بھیڑ میں کہیں کوئی بچہ دبا رہتا تھا تو کہیں کوئی عورت، عذر کرنے پر جواب ملتا۔ "اتنی بھیڑ میں جاتے کیوں ہو۔ دوسری گاڑی میں کیوں نہیں جاتے؟" لیکن دوسری گاڑی آنے تک کسی کا مقدمہ بگڑ جاتا تھا۔ کسی کی لگن گذر جاتی تھی کسی کا دوست مرتا جاتا تھا اور کسی کا سفر خرچ گھٹ جاتا تھا اور یہ سب اگر برداشت بھی کر لیا جاتا تو کون جانتا تھا کہ اگلی گاری خالی آئیگی جس میں ٹانگیں پھیلا کر سوتے جائینگے۔ یہ بیٹھنے اور سونے کا آرام یہ پڑھنے لکھنے کی آسائش، یہ کھانے پینے کی بےفکری پہلے کہاں نصیب تھی۔ پیسے والی کی جیب بھی تو کتری جاتی تھی۔

ہمارے قریب ایک ادھیڑ عمر کی عورت بیٹھی تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ آندھرا یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ آج چھ مہینے کے بعد ایک طویل سفر سے واپس جا رہی ہیں۔ آپ کا سفر بحری، فضائی اور برّی تینوں قسم کا تھا۔ آپ مدراس سے جہاز پر سوار ہوئیں وہاں سے لنکا پہنچیں۔ وہاں دو چار روز مشہور تاریخی مقامات کے سیر کرنے کے بعد جاوا اور بالی کے ملکوں میں گئیں اور پھر وہاں سے آسٹریلیا۔ میں نے اُن سے پوچھا "آسٹریلیا میں کیا صرف گورے لوگ بستے ہیں؟"

انھوں نے کہا "اب کہیں بھی صرف گورے، یا کالے یا پیلے یا سُرخ لوگ نہیں بستے ہر جگہ

ہر رنگ کے لوگ بستے ہیں۔ میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں نے لاسہ میں آپ کی تصویر دیکھی تھی اور آپ کے حالات اخبارات میں پڑھے تھے' آپ بیسویں صدی کی باتیں کر رہے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں اونچ 'نیچ کے خیالات میں اعتقاد رکھنے والی مختلف ذاتیں تھیں۔ اسی طرح دوسرے ملکوں میں بھی خود غرضی کی بنیاد پر انسانی نسل مختلف طبقوں اور قوموں میں تقسیم تھی۔ اب ان جھگڑوں کا کہیں پتہ نہیں۔ ہمارے آندھرا تامل اور کیرالا وغیرہ صوبوں میں پہلے کی باتیں یاد کرکے اگر آپ کسی سے دریافت کریں "کیا اب بھی تمھارے یہاں پریا'تھی آدی وغیرہ ذاتیں ہیں۔ کیا اب بھی وہ آئر اور نمبودری یا دوسری ذاتوں کے لوگ ہیں جو "نیچوں" کے سائے سے ناپاک ہو جاتے تھے۔

میں نے کہا "تو کیا۔ آپ کے کہنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اب یہ سب باتیں بالکل ختم ہو گئیں"؟

خاتون "ختم ہی نہیں ہو گئیں بالکل مدت ہوئی بھول بھی گئیں۔ اب وہ باتیں تاریخ کے طالبعلموں کے لئے کتابوں میں درج ہیں۔ اب آسٹریلیا یا دنیا کے کسی ملک میں پرانی جانبداری اور علٰحدگی کا رجحان نہیں ہے۔ ہر جگہ نووارد مہمان کی اسی طرح خاطر و تواضع کی جاتی ہے جس طرح اس کے اپنے وطن میں" میں نے پوچھا "میں آپ کو ہندی اور خالص ہندوستانی زبان بولتے سن رہا ہوں آپ کے ملک کی کرخت آواز والی زبان شمالی ہندوالوں کے لئے تو بے معنی تھی۔ آپ نے یہ زبان کب اور کہاں سیکھی؟

خاتون "ہر ایک ہندوستانی کی مادری زبان ہندوستانی ہے۔ اسلئے میری بھی یہی مادری زبان ہے۔"

میں نے کہا "تو کیا آندھرا والوں کی مادری زبان تیلگو نہیں ہے؟"

خاتون۔ "یہ نہیں بتا سکتی۔ تیلگو بھی لوگ جانتے ہیں، بہت دنوں تک یعنی تقریباً سنہ ۲۰۶۶ء تک ان کا اصرار تھا کہ تیلگو ان کی مادری زبان قرار دی جائے اور تمام کاروبار میں رائج کی جائے۔ لیکن چونکہ ہندوستانی سارے ہندوستان کی مناسب قومی زبان تھی اس لئے اس زبان کا سیکھنا بھی لازمی تھا۔ ورنہ ہندوستان کے مختلف حصوں کے لوگوں کو ایک دوسرے کے سامنے اجنبی بن جانا

پڑتا۔ لوگوں نے اس دہری محنت کے لئے بہت سا وقت خراب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ پھر اس طرف جب تمام دنیا کے ایک ہو جانے سے ایشیا والوں نے تمام دنیا میں رائج زبان کو اپنی بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا تو لوگوں پر اور بھی اثر پڑا۔ اب "ہندوستانی" کی طرح "عالمگیر زبان" کا جاننا بھی ہر ایک شہری کا فرض ہو گیا ہے۔ اس لئے ہندوستان کی مادری زبان ہو گئی۔ ایسا صرف وہیں نہیں بلکہ تامل، کیرالا، اور کرناٹک میں بھی ہوا"

میں نے کہا۔ "تو کیا آپ نے اپنی مادری زبانوں کی چتاؤں پر ہندوستانی کا محل اُٹھایا ہے؟"

خاتون۔ زبان کوئی جامد شے نہیں ہے۔ کون زبان ہے جو دو سو سال تک ایک ہی حالت میں رہ گئی ہو؟ ہمارے پڑوس میں تامل ناڈ ہے۔ وہاں آٹھ دس صدی پہلے جو زبان رائج تھی وہ آپ کی بیسویں صدی کی تامل زبان کے ارتقا سے پہلے مشکل کہی جاتی تھی۔ اس زمانہ کے لوگوں کے لئے پوری محنت اور وقت صرف کئے بغیر اس کا سمجھنا مشکل تھا۔"

میں نے کہا "تو آپ کی رائے میں زبان اور اسکے ادب کے تحفظ کا سوال ہی بیکار اور بے معنی ہے؟"

خاتون۔ "نہیں میں یہ نہیں کہتی۔ زبان کی بھی حالات کے مطابق حفاظت کرنی چاہئے۔ ادب کو تو اور بھی محفوظ رکھنا چاہئے۔ لیکن کسی مخصوص زبان کی حفاظت کیلئے پوری نسل انسانی کے اتحاد کی قربانی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اُس کی حفاظت کا کام چند عالم لوگ کر سکتے تھے جنکا لسانیات اور تاریخ اور مختلف ادبیات کیطرف رجحان تھا۔ یہ ذمہ داری اُن پر بغیر سوچے سمجھے چھوڑ دینی چاہئے۔ دنیا کی ترقی مختلف زبانوں کی علیحدہ علیحدہ تکمیل کرنے میں نہیں بلکہ زبان کے اختلاف اور حدود کو مٹا کر تمام دنیا میں ایک ہی زبان رائج کرنے میں پوشیدہ تھی۔ جس طرح دوسرے مفید کاموں میں انسان کی قدیم جانب دارانہ ذہنیت مخل ہوتی تھی اسی طرح یہ بھی ایک قدم بے معنی قسم کی جانبداری تھی۔ یہی وہ وہمی جانب داری اور تعصب تھا جسکی وجہ سے بیسویں صدی کے ہندوستان میں انسان مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو کر آپس ہی میں کٹ مر رہا تھا۔ یہ وہی اندھا اعتقاد تھا جس کی وجہ سے انگلستان میٹرک (اعشاریہ) ناپوں کو فرانس کی ایجاد سمجھ کر زیادہ مفید اور خالص

ہونے کے باوجود اُسے قبول نہیں کرتا تھا۔ اب اس طرح کے تعصب کی دنیا میں گنجائش نہیں۔ اب دنیا بھر کا اقتصادی نکتۂ نظر ایک ہی ہو گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کہ ہندوستان میں اردو اور ہندی کا جھگڑا تھا۔ زمانہ آیا کہ وہ جھگڑے مٹ گئے اور دونوں کی نمائندگی ہندوستانی زبان قومی زبان کی حیثیت سے کرنے لگی۔ پھر بڑی خشکی سے تمام صوبوں نے دیوناگری رسم الخط کو قبول کیا۔ آخرکار اب تمام صوبوں میں ہندوستانی زبان نے مادری زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔ قدیم زبانیں اب بھی پڑھی جاتی ہیں۔ اب بھی ان کا ادب زندہ ہے اور اس سے لوگ اپنے ذوق کی نشوونما کرتے ہیں لیکن اب اُس قسم کا بے معنی اعتقاد اور جذبہ موجود نہیں ہے جو پہلے تھا۔ پھر ہر شخص میں ادبی ذوق نہیں ہوتا جس کا رجحان جس طرف ہوتا ہو اُس کے لئے ادبیات کے مطالعہ کا بہترین انتظام ہے۔ اس زمانہ میں انسان کو کتنی سہولتیں حاصل ہیں اس کا اندازہ مجھے "عالمگیر زبان" کے ذریعہ آسٹریلیا اور ایشیا کے دوسرے ممالک کی سیر و سیاحت کے دوران میں ہوا جہاں میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میں اپنے وطن میں ہوں۔"

میں نے مذکورہ بالا غیر ممالک اور ان کے طور و طریق سے متعلق باتیں بڑی دلچسپی سے سُنیں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان خاتون کا نام کارگی تھا۔ میں نے سفر کے متعلق مزید دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آپ آسٹریلیا میں کچھ دن رہ کر بورنیو ہوتی ہوئی نیپون (جاپان) گئی تھیں۔ میں نے پوچھا کہ آسٹریلیا میں آبادی کتنی ہے۔ انھوں نے بتایا سولہ کروڑ، چین، ہندوستان، جاپان، اور دوسرے ملکوں سے جہاں بہت گھنی آبادی ہے بہت سے لوگ وہاں جا جا کر بس گئے ہیں۔ گذشتہ زمانہ کے انگلستان وغیرہ ملکوں کے لوگ بھی وہاں ہیں لیکن اُن کی تعداد اتنی بڑی آبادی کے مقابلہ میں برائے نام رہ گئی ہے۔ لیکن یہ واقعہ صرف تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ خود آسٹریلیا والوں کے لئے یہ حقیقت تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں نے دریافت کیا آپ نے نیپون میں فیوجی یاما بھی دیکھا ہو گا۔ وہاں ۲۲ء؁ کے چند منٹوں کے زلزلہ نے سات لاکھ کی قربانی لے لی تھی۔" انھوں نے جواب اثبات میں دیتے ہوئے بتایا کہ بعد ازاں وہ نانکنگ چلی آئیں تھیں پھر پیکنگ سے منچوریا کے

کئی مقامات کی سیر کرتی ہوئی سائبیریا پہنچیں اور اب قطب شمالی، سائبیریا، منگولیا اور تبت ہوتی ہوئی اپنے کالج کو لوٹ رہی تھیں۔ علم نجوم اور جغرافیہ سے آپ کو بڑی رغبت تھی۔ انھیں کے سلسلہ میں آپ نے اتنا طویل سفر اختیار کیا تھا۔ آپ کے ساتھ دو اور پروفیسر ایک وشو بھارتی کے پروفیسر حق اور دوسرے علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر وشوناتھ بھی تھے۔ یہ دونوں حضرات سامنے کی بنچوں پر بیٹھے تھے۔ پہلے انھوں نے بھی خیر مقدم کیا تھا لیکن مجھے ان کے پروفیسر ہونے کا علم نہ ہوا تھا۔ بات یہ ہے کہ لباس تو اب سب کے ایک ہی وضع قطع کے ہوتے ہیں۔ جب تک گفتگو کافی آگے نہ بڑھے یا کوئی باضابطہ تعارف نہ کرائے اس وقت تک یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ کون کیا ہے۔

آجکل کے جیل بھی عجیب قسم کے ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی کے جیلوں سے ان کا کوئی مقابلہ نہیں۔ اب قیدیوں کی ذرا ذرا سی بات میں گالی اور جوتے سے خاطر نہیں کی جاتی۔ آجکل کے لوگ ایسی باتیں سنکر پہلے والوں کی عقل پر افسوس کرینگے۔ آج کل یہ خیال عام ہے کہ جرم بھی انسان کسی دماغی یا جسمانی مرض میں مبتلا ہوکر کرتا ہے۔ چنانچہ اس مرض لاعلاج کا سامان کرنا چاہئے۔ مجرم کو تعلیم دیکر سدھرنے کا موقع دینا چاہئے۔ گذشتہ زمانے کے وہ لوگ کیا تعلیم دے سکتے تھے جنھیں قیدی اپنی ہی طرح چور ڈاکو سمجھتے تھے۔ چنانچہ آجکل کے جیلر نہایت عاجزی اور انکساری سے پیش آتے ہیں اور انھیں نفسیات اور طب میں مہارت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ بہت سے مجرموں کیلئے مناسب علاج ڈھونڈھ نکالتے ہیں جتنی سہولیت اور آرام سے مریض کو رکھا جاتا ہے اسی طرح مجرموں سے بھی سلوک کیا جاتا ہے۔ سزا صرف اتنی ہی ملتی ہے کہ اسکی نیک نامی جاتی رہتی ہے۔ کھانا ویسا ہی عمدہ، لباس ویسا ہی اچھا، جائے رہائش اور تعلیم وغیرہ بھی بالکل اُسی طرح۔ وہاں ایسے ماہر نفسیات اور ماہر طب جیلروں کے زیر تربیت رہکر وہ سدھر جاتا ہے۔ بعدازاں اپنے کام پر دوبارہ واپس آجاتا ہے۔ کل مریضوں کی تعداد بہت قلیل ہے لیکن مجرموں کی تعداد اس سے بھی قلیل ہے۔ بات یہ ہے کہ امیر اور غریب تو کوئی ہے نہیں۔ جو اشیاء کھانے پہننے اور روزانہ استعمال کی ایک کے پاس ہیں وہی دوسرے کے پاس بھی ہیں۔ جب آرام و آسائش یکساں طور پر سب کو میسر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ کوئی شوقیہ چوری کرے۔ پیٹ بھر کھانے کے لئے لذیذ

کھانے مجھے، میری بیوی، میرے لڑکے، لڑکیوں کو بغیر چوری یا دغابازی کے مل جاتے ہیں پھر میں چوری کیوں کروں کوئی چیز اگر چرا کر بیچنے کی کوشش کروں تو اوّل تو دنیا میں کوئی خریدار ہی نہیں ملیگا اور پھر اب روپیہ بھی تو معدوم ہے۔ روپیہ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بڑھاپے کے لئے؟ لیکن ضعیفوں کیلئے تو سماج کیطرف سے خدمتگاروں اور ہر قسم کے آرام کا ویسا ہی انتظام ہے جیسا مریضوں کیلئے۔ بیٹیوں، بیٹیوں کیلئے؟ لیکن تین سال تک، شہزادوں کیطرح بچوں کے پالے جانے کا ذکر کیا جا چکا ہے پھر تین سے بیس سال تک اُسی طرح آرام کے ساتھ عمدہ سے عمدہ تعلیم سے آراستہ ہونے کا انتظام سماج کی طرف سے موجود ہے تعلیم کے ختم ہونے کے بعد لڑکے کی لیاقت اور صلاحیت کا خیال کرتے ہوئے اُسی قسم کی لڑکی سے بغیر بارات، زیور، جہیز وغیرہ کے جھگڑوں کے اُسکی شادی ہو جاتی ہے۔ پھر روپیہ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ چنانچہ چوری آج کل کے نظام میں غیر ممکن ہے۔ زمینداری، کاشتکاری اور دولت کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں ہے۔ تمام چیزیں قومی دولت شمار کی جاتی ہیں۔ پھر دیوانی عدالت کا بھی وجود نہیں۔ ساتھ ہی زمین کے دخل اور بے دخلی کے جھگڑے، مار پیٹ، خون خرابے کا ہونا بھی بند ہو گیا ہے۔ آبکاری کا قانون، کارخانوں کا قانون، سکوں کا قانون، اسٹامپ کا قانون، ظالموں کا قانون وغیرہ ہزاروں قوانین کی جڑیں ہی کٹ گئی ہیں۔ ان میں بہت سی چیزوں کا نام دنیا سے بھی اٹھ چکا ہے۔ اب جرم صرف یوں ہو سکتا ہے کہ گفتگو کے دوران میں کہیں کسی سے تکرار یا جھگڑا ہو جائے۔

اس دور میں مرد و عورت دونوں آزاد ہیں۔ دونوں کا رشتہ محبت کا ہے۔ شوہر کا بیوی پر اتنا ہی حق ہے جتنا کہ بیوی کا شوہر پر۔ شوہر صرف مرد ہونے کی وجہ سے اپنی بیوی پر زیادہ حقوق نہیں رکھتا۔ شادی بھی دونوں کے جوان ہونے پر عمدہ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہونے کے بعد دونوں کی پوری پوری رضامندی سے بغیر کسی دباؤ اور بغیر دولت کی لالچ کے طے پاتی ہے۔ ایسی حالت میں دونوں کی محبت کا غیر فانی ہونا فطری ہے لیکن اگر نباہ نہ ہو سکے یا کسی خاص وجہ سے یا جلدی بازی میں انتخاب میں غلطی ہو گئی ہو تو فوراً علحدگی اختیار کی جا سکتی ہے۔ دونوں کے راستے کھلے ہیں۔ دونوں شادی کا رشتہ توڑ کر اپنا اپنا راستہ لے سکتے ہیں۔ ان کے ایسا کرنے میں سماج کیطرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود اگر بدچلنی سے کہیں جھگڑا فساد یا مارپیٹ کا موقع آجائے تو البتہ جیل کے لئے قیدی مل جاتے ہیں۔ پھر سخت تنبیہ اور تاکید کے بعد بھی قومی اصولوں اور قوانین کی خلاف ورزی نہ کرنے سے بھی السان جیل بھیجا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ جرم کے یہی تین چار اسباب رہ گئے ہیں۔

ان تمام باتوں پر غور کرنے سے اور ان مجرموں کا بیسویں صدی کے مجرموں کا مقابلہ کرنے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آگے چل کر قیدی کتنے تھوڑے رہ جائینگے۔ معلوم ہوا کہ نیپال بھر میں ایک ہی جیل ہے جس میں کل پچاس قیدی ہیں۔ بہار میں بھی ایک ہی جیل ہے جس کے قیدیوں کی تعداد کبھی سو سے زیادہ نہیں ہوئی۔ یہ بات ہندوستان ہی کے صوبوں میں نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی ہے۔ پرانے زمانہ میں چوری کے لئے بڑی بڑی سزائیں مقرر تھیں، اسکا وجود اقتصادی نظام کے نقص پر مبنی تھا۔ دوسروں کی محنت کی کمائی کو قانون کی بھول بھلیوں میں ڈال کر ہڑپ کر جانیوالے تو مہاجن اور زمیندار تھے اور رات دن خون پسینہ ایک کرنے والے اگر اپنی اولاد کو بھوک سے مرتے دیکھ کر مجبوری کی حالت میں انھیں پرائے مال کو ہڑپ کر جانے والے مہاجنوں اور زمینداروں کی دولت کا تھوڑا سا حصہ لینے کی کوشش کرتے تو ان کو مجرم قرار دیا جاتا تھا۔ بات یہ ہے کہ اُس زمانہ کی فضا ہی دوسری تھی۔ دو چار آدمیوں کی تعداد میں دوسرے کی دولت چرانے والے اور سو پچاس کی تعداد میں دن دھاڑے دوسروں کی دولت پر حملہ کرنے والے تو چور اور ڈاکو کہے جاتے تھے لیکن ہزاروں کی تعداد میں دوسروں کی پیدائشی زمین چھین لینے والے "فاتح اعظم" کہلاتے تھے سکندر اور ایک ڈاکو میں خاصیتی اعتبار سے کوئی فرق نہیں تھا صرف جرم کی مقدار کا فرق تھا۔ اور مقدار کے اعتبار سے معاملہ کچھ اور ہی ہونا چاہئے تھا۔ چھوٹے جرم کرنے والا چھوٹا مجرم اور بڑے جرم کرنے والا بڑا مجرم ہونا چاہئے۔ اسی طرح سکندر وغیرہ جیسے عظیم الشان چوروں کی مذمت ہونی چاہئے تھی۔ لیکن وہ دنیا ہی دوسری تھی۔ چور اور ڈاکو کہنے کے بجائے لوگ اُلٹا انھیں بلند اقبال، پر شکوہ اور عظیم الشان اور فاتح عالم کہتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ اسوقت کے زمانہ کے اکثر جرم تشدد سے کرائے جاتے تھے۔

ہماری گاڑی فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ نشیب و فراز اور پہاڑ کے سرنگوں سے ہو کر ہمارا

راستہ گیا تھا۔ آس پاس کے پہاڑوں پر مختلف قسم کے پھلوں کے باغات تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہماری گاڑی پہاڑی راستہ چھوڑ کر گھنے جنگلوں میں داخل ہوئی۔ چاروں طرف پرانے پرانے "سال" کے اونچے اور موٹے درخت کھڑے تھے۔ درمیان میں اور بھی کئی قسم کے بڑے بڑے درخت تھے مجھے معلوم تھا کہ اس ترائی میں شیر، ہاتھی اور کئی قسم کے جانور رہتے ہیں لیکن جب میں نے ان کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان جنگلوں میں اُن خطرناک جانوروں کا اب نام ونشان بھی نہیں۔ سارے خطرناک جانور مار ڈالے گئے ہیں۔ لیکن ان کی نسلیں ابھی چڑیا خانوں میں محفوظ ہیں۔ جو دو چار نر اور مادہ چڑیا خانوں میں رکھے گئے ہیں اُن کو کھانے کے لئے نقلی گوشت کے ٹکڑے دئے جاتے ہیں۔ لیکن جانور ان کی تمیز نہیں کر سکتے۔ ہاتھیوں کو بھی پھنسا کر جنگل خالی کر دئے گئے ہیں۔ ان کی نسل کو سائنٹفک طریقوں سے آہستہ آہستہ ختم کر دیا گیا۔ صرف نمائش اور تعلیم کی ضرورت کے لئے دو چار ہاتھی محفوظ رکھ لئے گئے ہیں۔ چنانچہ اب یہ جنگل خطرے سے بالکل خالی تھا۔

پانچ چھ میل آگے جانے کے بعد ایک اسٹیشن آیا۔ جس کا مال گودام بہت بڑا تھا۔ یہاں سے دو لائنیں جنگلوں کی طرف گئی تھیں۔ ان کے متعلق دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ لائنیں بہت دور تک جنگلات کے اندر گھستی چلی گئیں ہیں۔ یہاں سے پورب کی طرف کچھ دور پر ایک بڑا سا گاؤں ہے جس کا نام "کاغذ گاؤں" ہے جس میں دس ہزار لوگ آباد ہیں۔ یہ گاؤں بھی ساخت وغیرہ کے اعتبار سے دوسرے گاؤں کی طرح تھا۔ وہاں کے رہنے والوں کو بھی ہر قسم کے آرام وآسائش کے سامان مہیا تھے۔ "کاغذ گاؤں" میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کاغذ کا ایک بہت بڑا کارخانہ تھا۔ لکڑیوں کے کاٹنے اُس کے ٹکڑے کرنے اور اُسے اُٹھا کر کارخانہ تک لے جانے، چیرنے، پھاڑنے، پکانے، گلانے، لب تیار کرنے، کاغذ بنانے، کاٹنے اور تہہ لگانے وغیرہ کے تمام کاموں کے لئے برقی مشینوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں سے کاغذ تیار ہو کر چھاپہ خانوں میں جاتا تھا۔ ردی کاغذ اور سڑے گلے کپڑوں وغیرہ سے بھرے ریل کے ڈبے میں نے لائنوں پر کھڑے دیکھے جنکے متعلق معلوم ہوا کہ یہ سب

کاغذ بنانے کے لئے جا رہے ہیں۔ چونکہ کاغذ بنانے کے سب مواد بانس، گھاس لکڑی وغیرہ یہاں بڑی مقدار میں ملتے جاتے تھے اس لئے یہاں اس کا کارخانہ کھولا گیا تھا۔ وہاں سے آگے لکڑی کے کارخانے والے بھی گاؤں ہیں۔ جن میں مشینوں سے لکڑی کے تختوں کو چیر کر چوکھٹ، کواڑ، چوکی، تپائی وغیرہ تمام لکڑی کے سامان تیار کئے جاتے تھے۔

گاڑی غرّاتے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا اب تھوڑی دیر میں جنگل سے پار ہو جائیں گے۔ لیکن کافی وقت گذر جانے کے بعد بھی گاڑی جنگل ہی کے حدود میں تھی۔ اب جنگل میں زیادہ تر درخت ساگون کے ملنے لگے۔ میں نے پوچھا۔ ایسی لکڑیاں تو میں نے اس طرف نہیں دیکھی تھیں۔ وشواسر نے کہا لکڑیاں ہی نہیں بلکہ یہاں پر کھیت اور گاؤں تھے۔ سو سال سے کچھ زیادہ کا عرصہ گذرا جب یہاں ساگون کا جنگل لگایا گیا تھا۔ اور اب اس علاقہ میں لکڑی کی چیزیں بنانے والے کئی گاؤں ہیں اس ترائی کے لکڑی اور کاغذ کے کارخانوں سے آدھے ہندوستان کا کام چلتا ہے۔ اس جنگل میں بارش ہونے کی وجہ سے آگے کے پہاڑوں میں بھی تراوٹ پہنچتی ہے۔ ترائی کے ساگون اور سال کی لکڑی بڑی مضبوط اور خوبصورت ہوتی ہے۔

گاڑی درمیان میں دو دو تین تین منٹ رکتی ہوئی آگے کی طرف رواں تھی۔ کسی کسی اسٹیشن پر مرد و عورت میرے آنے کی خبر سن کر مجھے دیکھنے کیلئے اسٹیشنوں پر آئے ہوئے تھے۔ مجھے اترنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کھڑکی ہی پر بیٹھا ہوا تھا اور میری سفید بڑی بڑی ڈاڑھی لوگوں سے میرا تعارف کرا دیتی تھی۔ جب گاڑی رکتی تو تھوڑی دیر کے لئے ہماری گفتگو کا سلسلہ

منقطع ہو جاتا تھا۔ ورنہ گاڑی کی طرح ہماری گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اب ہم لوگ جنگلوں سے باہر سرسبز میدان میں رواں تھے میں نے پوچھا "جیٹھ کے ماہ میں بھی ان میدانوں میں ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔ کیا آپ لوگوں نے اور چیزوں کی طرح بادلوں کو بھی اپنے قابو میں کر لیا ہے؟" پروفیسر حق نے جواب دیا اب پانی برسانا بھی ہمارے قبضہ و قدرت میں ہے۔ ضرورت کے وقت سائنس کے طریقوں سے بارش کرا دی جاتی ہے۔ لیکن اس مقام پر تو مختلف اوقات میں ہری ہری گھاسوں کو جگہ جگہ پھیلے ہوئے نالوں کے پانی سے سینچا جاتا ہے۔ بارش عموماً اونچے اور خشک پہاڑوں کو سرسبز کرنے کے لئے کرائی جاتی ہے۔ دیکھئے یہاں پر کی زمین سطح دریا کی طرح ہموار ہے۔" میں نے پوچھا "برسات کا پانی زمین کو کاٹ کاٹ کر اوبڑ کھابڑ نہیں بنا دیتا؟" پروفیسر حق نے کہا "پانی کا بس چلتا تو وہ ایسا کرنے سے کب باز رہتا۔ لیکن اب اُس کے نکاس کے راستے بنا دئے گئے ہیں۔ کتنی ہی بارش ہو پانی اُن پختہ راستوں اور نلوں کے ذریعہ بڑے نالوں سے ہو کر دریا میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ ریل کی سڑک کو دیکھئے قدم قدم پر لوہے کے پل ہیں پانی کے راستہ میں کہیں رکاوٹ نہیں ہے۔" میدانوں میں اب گایوں کے جھنڈ چاروں طرف بکھرے ہوئے نظر آنے لگے۔ اب تک سڑک کے کنارے تار نہیں نظر آتے تھے۔ لیکن اب میدانوں کو تار سے چاروں طرف سے گھیر دیا گیا تھا۔ تاکہ گائیں چلتی گاڑی کے آگے نہ آجائیں۔ گائیں بہت خوبصورت اور بڑی بڑی تھیں جن کی صورت دیکھتے رہنے کی طبیعت چاہتی تھی۔ گایوں کے بچھڑے الگ کر کے دور چرائے جا رہے تھے۔ ہری ہری گھاسوں کو بڑے پریم سے گائیں چر رہی تھیں۔ میں نے پوچھا "اب دانا کھلی کی انھیں کیا ضرورت ہے؟" اس پر پروفیسر وشوناتھ نے کہا "پھر بھی کھلی، مکئی، اور کنگی اور چوکر انھیں دیا جاتا ہے۔

شام کو تھان پر پہنچتے ہی اُن کو یہ لذیذ غذا دی جاتی ہے۔ میدان میں جگہ جگہ لمبے لمبے ٥ پختہ حوضوں میں صاف پانی لبالب بھرا ہوا تھا۔ پانی اس میں مسلسل آتا اور نکلتا رہتا تھا۔ یہاں گائیں آکر پانی پیتی تھیں۔ جگہ جگہ ہرے ہرے درختوں کے سائے میں گائیں بیٹھی جگالی کر رہی تھیں۔ گایوں کے جھنڈ میں کئی بڑے بڑے دیوزاد سانڈ بھی نظر آئے۔ ان میں کچھ گھاس چر رہے تھے اور کچھ ڈکار رہے تھے۔ سانڈوں کو دیکھتے ہی مجھے ایک بات یاد آگئی اور میں نے پروفیسر حق سے دریافت کیا۔ آپ لوگ کھیت تو بجلی کے ہلوں سے جوتتے ہیں اور گاڑی بھی بجلی ہی سے چلاتے ہیں۔ بیلوں کے کھانے والے بھی نہیں۔ سو گایوں پر دو تین سانڈوں کی ضرورت پڑتی ہوگی۔ پھر اتنے بچھڑے جو پیدا ہوتے ہوں گے وہ کس کام میں آتے ہیں؟"

پروفیسر حق نے کہا "ہم لوگ پیدا ہی اتنے بچھڑے ہونے دیتے ہیں جتنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ باقی بچھیاں ہی پیدا کرائی جاتی ہیں"۔

میں نے حیرت سے کہا "آپ نے یہ علم بھی حاصل کر لیا ہے"۔

حق۔ "ہاں ہاں، جو جو ضرورتیں اور مشکلات راستہ میں آتی گئیں ہم محنت اور غور و خوض کر کے اُن کو حل کرتے گئے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ بھئی آپ لوگوں نے ہر بات میں کمال کر دکھایا اور انسان کی تمام مشکلات کو حل کر دیا ہے۔ غیر ممکنات کو ممکنات میں تبدیل کر دیا۔ آپ لوگ شاید ایک بھی غیر ممکن بات نہ جانتے ہوں گے۔ یہی گائیں ہیں جن کے لئے بیسویں صدی اور اس سے پہلے کے ہندو مسلمان قیامت تک کے لئے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن بیٹھے تھے۔

حق۔ ہمارے وہ آباؤاجداد رخصت ہو گئے اُن کے لئے اب کچھ کہنا تو ٹھیک نہیں۔ پھر بھی یہ اُن کی جہالت تھی۔ دونوں اپنی مستقل اور پائیدار خیر و فلاح سمجھنے

سے قاصر تھے۔ سونا لٹا جارہا تھا اور کوٹھوں پر تھم لٹھا کرتے تھے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ آج جب ہم اُن پرانی باتوں کو کتابوں میں پڑھتے ہیں تو ہنسی آئے بغیر نہیں رہتی۔

اب معلوم ہوا کہ اگلا اسٹیشن گائے گاؤں ہے۔ میں نے گائے گاؤں کے متعلق بہت کچھ دریافت کیا جس کا خلاصہ یہ ہے۔ اس گاؤں میں پانچ ہزار آدمیوں کی ضرورت ہے اصل میں گاؤں کی آبادی کو گائے گاؤں کی بجائے "گوپال گاؤں"[1] کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ کیونکہ گاؤں میں تو ایک بھی گائے نہیں رہتی۔ گاؤں اسٹیشن سے ملحق ہے اور مویشی خانہ وہاں سے ایک میل کی دوری پر واقع ہے۔ چراگاہ تو کئی میل میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس میدان میں جگہ جگہ گھاس کے تاڑ کے اتنے اونچے ڈھیر لگے تھے۔ گائے بچھڑے اور بچھیاں سب ملا کر تعداد ایک لاکھ تک پہنچ جاتی تھی۔ ان میں سے غالباً آدھی دودھ دینے والی گائیں تھیں۔ لیکن اتنی گایوں کو دوہتا کون تھا۔ سائنس نے جس طرح اور مشکلات کو حل کر دیا ہے اُسی طرح اس مشکل کو بھی دور کر دیا ہے۔ گائیں قطاروں میں کھڑی رہتی ہیں۔ اِن کے درمیان سے موٹے موٹے نل گذارے جاتے ہیں۔ اور ان نلوں سے پھر چھوٹے چھوٹے نل گایوں کے نیچے سے گذرتے ہیں۔ اِن چھوٹے چھوٹے نلوں میں ربڑ کی نلیاں لگی رہتی ہیں جو اُن کے تھن سے لگا دی جاتی ہیں۔

مشین کے ذریعہ تمام دودھ دوہے جانے کے بعد بڑے بڑے نلوں کے ذریعہ ریل کے ڈبے میں جا کر گرتا ہے۔ ڈبے بھرتے جاتے ہیں اور جن گاؤں میں اُن کی مانگ ہوتی ہے وہاں روانہ کر دئے جاتے ہیں۔ یہاں دودھ میں ہوا بھی نہیں لگتی اور وہ ڈبے میں بند ہو جاتا ہے۔ بڑے برتنوں سے چھوٹے برتنوں میں بھی اسی قسم کے نلوں کے ذریعہ اُسے منتقل کیا جاتا ہے۔ جن گاؤں میں اُن کی مانگ ہوتی ہے وہاں بھی اُسی طرح یعنی بند حالت میں اُسے بجلی کی آنچ سے گرم کر دیا جاتا ہے صرف پینے کے وقت دودھ میں

---

[1] گوپال گاؤں سے مراد ہے وہ گاؤں جس میں گوپال چرواہے یعنی گائے پالنے والے بستے ہیں۔

تھوڑی دیر کے لئے ہوا لگتی ہے۔ "گائے گاؤں" میں دودھ گرم کرنے کا کوئی بکھیڑا نہیں یہاں والوں کا کام ہے صرف گایوں کی حفاظت کرنا۔ اُن کی اچھی نسل پیدا کرنا۔ دودھ دوہنا اور مختلف مقامات پر ضرورت کے مطابق بھیجنا اور بس۔ بچّہ والی اور بغیر بچّہ والی گائیں علٰحدہ علٰحدہ مقامات پر رکھی جاتی ہیں اور اُن کی چراگاہیں بھی علٰحدہ ہیں جہاں وہ خود اپنی مرضی سے اِدھر اُدھر نہیں ٹہل سکتیں۔ گائے۔ بھینس۔ بھیڑ۔ بکری کے گاؤں میں کچھ گھوڑے بھی پالے جاتے ہیں۔ چرواہے گھوڑوں پر چڑھ کر حسب خواہش اپنے گلّے کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ بیمار اور بڈھے جانوروں کے آرام اور علاج کا اتنا ہی انتظام ہے جتنا انسانوں کے آرام و آسائش کا۔ گاؤں کے لوگ اپنی ڈیوٹی کے مطابق اپنا اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ گائے گاؤں، کھیتی والے گاؤں کو لاکھوں من کھاد دیتا ہے۔ یہ کھاد مسلسل طور پر ریلوں کے ذریعہ مختلف گاؤں میں پہنچتی رہتی ہے۔

اگلا اسٹیشن "بھینس گاؤں" کا اسٹیشن تھا۔ وہی چراگاہ یہاں تک پھیلی ہوئی چلی آئی تھی جیسی خوبصورت اور جسیم گائیں وہاں نظر آئی تھیں ویسی ہی بھینسیں دیکھنے میں آئیں ان کے سامنے ہانسی اور حصار کی بیسویں صدی کی بھینسیں ہیچ تھیں۔ کالے کالے جسم، اُن کے بعض شیشے کے بوتلوں کی طرح جھلکتے تھے جن کے دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ اگر ایک من نہیں تو کچھ ہی کم دودھ دیتی ہوں گی "بھینس گاؤں" کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہاں بھی اتنی ہی بھینس ہیں جتنی "گائے گاؤں" میں گائیں ہیں۔ رفیق حق کا جواب سن کر میں نے دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا۔ "بھینسوں کو پانی میں بیٹھنے سے بڑی محبت ہے چنانچہ اُن کے لئے جگہ جگہ پر تالاب کھُدے ہوئے ہیں جن میں پانی آتا اور نکلتا رہتا ہے۔ کھانے پینے، رہنے سہنے، دوا علاج سب کا انتظام "گائے گاؤں" کی طرح ہے۔ لیکن "بھینس گاؤں" میں دس ہزار آدمی آباد ہیں اور اُن کا کام بھی زیادہ ہے۔ بات یہ ہے کہ گائے کے دودھ کی طرح بھینس کا دودھ

باہر نہیں بھیجا جاتا بھینس کا دودھ ڈاکٹر کی رائے سے کہیں کہیں تھوڑا بہت بھیجا جاتا ہے ورنہ تمام دودھ کا مشین کے ذریعہ مکھن نکال لیا جاتا ہے۔ یہ مکھن برف سے محفوظ کئے ہوئے گاڑی کے ڈبوں میں بند کر کے مختلف مقامات پر بھیجا جاتا ہے۔ ضرورت کے مطابق مکھن سے گھی بھی بنتا ہے۔

"لیکن کیا مکھن سے گھی نکالنے کے بعد ہزاروں من دودھ پھینک دیا جاتا ہے؟"

"نہیں یہاں بٹن بنانے کا ایک بہت بڑا کارخانہ ہے۔ دودھ کا سفید ثقیل جزو کیمیائی طریقہ سے علحدہ کر کے اس سے مختلف رنگوں کے بٹن بنائے جاتے ہیں۔ بٹن ہی نہیں بلکہ دروازوں اور مشینوں وغیرہ کے سفید دستے بنانے میں بھی استعمال ہوتا ہے تاکہ چھونے سے ہاتھ کالا نہ ہو جائے۔ ایک طرف بجلی نے دھوئیں کو دنیا سے رخصت کر دیا ہے تو دوسری طرف اس ترکیب سے ہاتھ کا کالا ہونا بھی بند ہو گیا ہے۔

آجکل کارخانوں میں کام کرنے والے آدمیوں کا رنگ کالا نہیں ہوتا۔ آرٹ پیپر کو چکنا کرنے کے لئے بھی اس سفیدی کا استعمال ہوتا ہے۔ اب ہاتھی دانت تو ملتا نہیں لیکن اس خالص دودھ سے ہاتھی دانت کا کام اور اس کے ساتھ ہی اور بہت سے کام نکالے جاتے ہیں۔ گھاس کا ذخیرہ تو میں نے کہیں کہیں پر دیکھا لیکن پیال بھوسے کا ڈھیر کہیں نہیں نظر آیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دھان اور گیہوں وغیرہ کے ڈنٹھل بھی اگرچہ مشین سے کاٹے جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی بالیاں ڈنٹھل کے کچھ حصہ کے ساتھ کاٹ کر علحدہ رکھ دی جاتی ہیں اور ڈنٹھل کا بوجھ الگ بندھا جاتا ہے اس ڈنٹھل اور پیال کی بعد میں گانٹھیں باندھ کر کاغذ کے کارخانوں میں بھیج دی جاتی ہیں۔ گائے بھینسوں کے کھانے کے لئے ہری اور سوکھی گھاس ہی کافی ہوتی ہے

ساڑھے نو بجے گولہ پاس کے کسی گاؤں میں چھوڑ گیا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے

تمام لوگ بنچوں پر آکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں ہوا میں چھت کے تار کے سہارے
تیرتا ہوا ہمارے ناشتہ کا تختہ سامنے آگیا۔ اس وقت کھانے میں کچھ اور ہی چیزیں
تھیں ایک چھوٹی سی طشتری میں گول مرچ کے ساتھ گھی میں تلے ہوئے نمکین
ہرے مٹر اور ہرے چنے کے دانے تھے۔ دودھ میں ملا ہوا ایک ایک گلاس گنے کا کچا
رس الگ رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ پھل بھی تھے۔ معلوم ہوا کہ آج کل کے لوگ
پرانے گاؤں کی نعمتوں سے بھی محروم نہیں ہیں۔ بتایا گیا کہ اسی طرح ہر موسم کی چیزیں
بچوں، بوڑھوں، مردوں اور عورتوں کے پاس پہنچ جایا کرتی ہیں۔ مکئی کی فصل میں
بھٹے اسی طرح ناشتے کے وقت پہنچ جاتے۔ اگر ہم اس موسم میں سفر کرتے ہوئے گاڑی
کے تمام مسافروں نے ناشتہ کیا۔ میرے دل میں اُس وقت یہ خیال آیا کہ اِسی زمانہ
کے متعلق بیسویں صدی کے ہندو کہا کرتے تھے۔ آئندہ زمانہ بہت ہی تاریک قسم کا
کلجگ ہوگا، دنیا جہنم کا نمونہ بن جائیگی۔ لیکن یہ تمام مناظر تو بہشت کے معلوم
ہو رہے تھے۔ شائد اُس زمانہ کے خود غرض لوگوں کو تمام دنیا والوں کا اس طرح
عیش و آرام اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرنا جہنم معلوم ہوتا تھا۔ ہاتھ منہ دھوکر
میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو کھیتوں میں کوسوں تک چنے کی ہریالی ہی ہریالی
نظر آئی۔ چنوں کے علاوہ اور کوئی چیز کھیتوں میں نہیں تھی۔ دریافت کرنے کے
بعد معلوم ہوا کہ اگلا اسٹیشن "چاول گاؤں" ہے۔ وہاں صرف دھان
اور چنے کی کاشت ہوتی ہے۔ دھان کی فصل کٹ جانے کے بعد اُنھیں کھیتوں میں
چنے بو دیئے جاتے ہیں۔ پچاس پچاس بیگھوں کی ایک ایک کیاری تھی جن کے چاروں
طرف اونچی منڈیریں بنی ہوئی تھیں۔ باسمتی، کشن بھوگ، کنک زیرہ وغیرہ عمدہ
قسم کے دھانوں کے سوا موٹے دھان کی تو اب کاشت ہی بند ہوگئی۔ اسکولوں میں
دھان کی مختلف قسموں کو برقرار رکھنے اور اُن کی پہچان کے لئے یہ دھان تھوڑی مقدار

میں بوئے جاتے ہیں۔ ورنہ کھانے کے لئے صرف عمدہ قسم کے دھان کی کاشت کی جاتی ہے۔ یہ چاول گاؤں بھی دس ہزار آدمیوں کا گاؤں ہے۔ یہاں کھیتی کے ساتھ ساتھ دھان سے چاول کے الگ کرنے کے بھی کارخانے ہیں۔ دھان کوٹنے کا کام مشین ہی سے ہوتا ہے۔ ایک طرف چاول تیار ہوتے جاتے ہیں اور دوسری طرف گاڑیوں میں مختلف مقامات پر روانہ ہوتے جاتے ہیں۔ چنے کی دال اور بیسن اس کے علاوہ خالص چنے بھی یہاں سے چالان کے لئے جاتے ہیں۔ پیال تو کاغذ کے کارخانوں میں جاتا ہے لیکن دھان کی بھوسی اور دوسرے کوڑے کرکٹ کو کھنڈروں میں سڑا کر کھاد تیار کی جاتی ہے باقی کھاد "گائے گاؤں اور بھینس گاؤں" سے آتی ہے۔ بہت سے جانوروں کے گاؤں میں ہڈی پیسنے کے کارخانے ہیں۔ مردہ جانوروں کے متعلق پہلے بتایا جاچکا ہے کہ ان کی کھال نہیں اتاری جاتی ہے بلکہ ان کو دفن کر دیا جاتا ہے۔ بعد میں سڑی مٹی تو کھاد کے مقامات پر بھیج دی جاتی ہے اور ہڈیوں کو مشینوں میں پیس کر چورن تیار کیا جاتا ہے۔ یہاں ان سے بڑی مقدار میں فاسفورس بھی نکالی جاتی ہے جو دیا سلائی بنانے کے کام آتی ہے۔ اگرچہ سگریٹ کے بند ہونے اور آگ کی جگہ پر بجلی کا استعمال ہونے سے دیا سلائی کا خرچ بہت کم کیا تقریباً بالکل ختم ہو گیا ہے۔ پھر بھی دو ایک کارخانہ دیا سلائی کے ضرور موجود ہیں۔

"چاول گاؤں کے کھیل کا میدان اسٹیشن کے پاس سڑک کے کنارے واقع تھا۔ ہزاروں مرد و عورت وہاں جمع تھے۔ فٹ بال کھیلا جا رہا تھا اور بڑے بڑے جوان کھیل میں مصروف تھے۔ وہ ایک گول ہوا اور حاضرین نے تالیاں بجا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ آگے دوسری طرف کبڈی جمی ہوئی تھی۔ ہری گھاس پر جانگیا اور بنیاین پہنے لوگ کبڈی کھیل رہے تھے۔ یہ مقام سڑک سے ملحق تھا اور گاڑی کی رفتار بھی اسٹیشن کے قریب آجانے کی وجہ سے دھیمی ہو گئی تھی اس لئے ان کے

سڈول، خوبصورت اور تندرست جسم صاف نظر آ رہے تھے

ریل کی سڑکوں کے نیچے سے جگہ جگہ نہریں رواں ہیں۔ وشوامتر نے کہا۔ "اب گنگا، جمنا، گنگا وغیرہ ندیوں کی دھارا اتنی موٹی نہیں ہے جتنی کہ پہلے تھی۔ سارے ملک میں نہروں کا جال بچھا ہے۔ ان ندیوں کے پانی کا بہت سا حصّہ تو اوپر ہی اوپر نہروں میں چلا جاتا ہے۔ تمام گاؤں میں بجلی کے استعمال سے کارخانوں میں بھاپ پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ وہاں پانی کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن ہر چیز کو تازہ اور صاف رکھنے کے لئے پانی کی یقیناً ضرورت ہوتی ہے۔ کھیتی اور باغ والے گاؤں میں سینچنے کے لئے پانی کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے۔ پانی اور بجلی یہی دونوں آج کل کی دنیا کی جان ہیں۔ بلکہ بجلی بھی پانی ہی سے پیدا کی جاتی ہے۔ اس لئے پانی آج کل سب کچھ ہے۔ اس کا آج جتنے بڑے پیمانہ پر خرچ ہے اُسی قدر اس کی فضول خرچی کی روک تھام کی جاتی ہے۔ جنگل سے نکلنے کے بعد زمین زیادہ تر ہموار ملی۔ اب پہاڑ دور دُھندلے بادلوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ چاروں طرف میدان ہی میدان تھا۔ گاؤں کے پاس ہی درخت تھے ورنہ درختوں کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ کھیتوں میں کھاد لے جانے اور اناج ڈھونے کے لئے چھوٹی چھوٹی گاڑیوں کی پتلی پتلی لوہے کی پٹریاں نظر آ رہی تھیں چنے اگرچہ پھیلے ہوئے تھے مگر ابھی پکے نہیں تھے لیکن رکھوالوں کی جھونپڑیاں کہیں نظر نہ آتی تھیں "چاول گاؤں" اسٹیشن سے کوسوں آگے تک چنے کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔

اب زمین کچھ اونچی ہونے لگی ہے۔ چنے کی بجائے بڑی بڑی بالیوں والے گیہوں کے کھیت پھیلے ہوئے ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف جہاں تک نظر جا سکتی ہے گیہوں کے ہرے ہرے کھیت ہی نظر آ رہے ہیں۔ ہوا کے جھونکوں سے ہلتے ہوئے یہ پودے خاموش سمندر میں ہلکی پھلکی لہروں کی طرح معلوم ہو رہے ہیں۔ آجکل کے

گیہوں کے ذائقہ اور آٹے کی سفیدی کیا کہنا ہے۔ لیکن مجھکو ابھی گیہوں کے دانے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا میں نے "وشوا" سے پوچھا کیا ہمارے زمانہ کے پوسا نمبر ۳ سے بھی یہ دانے اچھے ہوتے ہیں" انھوں نے کہا "پوسا نمبر ۳ اسکول کی تجربہ گاہوں میں رکھا ہوا ہے۔ وہ بھلا آجکل کے گیہوں کا کیا مقابلہ کرسکتا ہے۔ کھیت کی جتائی۔ کٹائی۔ دنوائی وغیرہ تمام چیزوں کے متعلق میں یہ معلوم کرچکا تھا کہ یہ سب کام بجلی کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔ ایک ایک "موٹر ہل" میں دس دس ہل قطار سے لگے رہتے ہیں۔ جو ایک ہاتھ گہری زمین کھود دیتے ہیں۔ مشین کے پچھلے حصہ میں لوہے کا سیراون لگا رہتا ہے جو ڈھیلوں کو پیستا اور زمین کو برابر کرتا ہے۔ بونے کا کام بھی مشینوں ہی سے ہوتا ہے پکے ہوئے کھیتوں کو کاٹنا۔ بوجھ باندھنا اور اُن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا یہ تمام کام مشینیں انجام دیتی ہیں۔ اچھی کھاد اور پانی کی افراط ہونے کی وجہ سے فصل جیسی چاہتے ہیں ویسی ہی ہوتی ہے گیہوں کی سال میں دو فصلیں ہوتی ہیں۔ برسات میں مکئی اور باجرا بویا جاتا ہے پھر اس کے بعد گیہوں۔ مکئی اور باجرا آجکل کے لوگ صرف بھٹے اور ہولہ کھانے کیلئے بوتے ہیں۔ ورنہ عام طور سے یہ غلہ گائے اور بھینس کو کھلایا جاتا ہے۔ ان کے ڈنٹھل کاغذ کے کارخانوں میں جاتے ہیں اور اگر ڈنٹھل ہرے ہیں تو پاس کے کسی "جانور گاؤں" میں جانوروں کے منہ کا مزہ بدلنے کے لئے بھیج دیئے جاتے ہیں۔

اس "گیہوں گاؤں" میں آٹا پیسنے کا بہت بڑا کارخانہ ہے۔ اگرچہ عام طور پر "گیہوں گاؤں" میں کھیتی کے ساتھ ساتھ پسائی کا انتظام نہیں ہوتا۔ لیکن نزدیک میں پسائی کے کارخانہ کی عدم موجودگی کے سبب اس گاؤں کی آبادی دس ہزار کردی گئی ہے اور یہاں پسائی کا کارخانہ کھول دیا گیا ہے۔ آٹا۔ میدہ وغیرہ سب کچھ یہیں تیار ہوجاتا ہے۔ "گیہوں گاؤں" کی سرحد کے ختم ہونے پر آم اور لیچی وغیرہ کے درخت

نظر آنے لگے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اب ہم موتی ہاری کے نزدیک آگئے ہیں، یہ باغیچہ ایک اسکول کا ہے۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ تین سال کے بعد لڑکے لڑکیاں ماں باپ اور مقام پیدائش سے الگ کر کے اسکول بھیج دیئے جاتے ہیں ہر تیس یا چالیس گاؤں پر ایک اس قسم کا اسکول رہتا ہے جس میں دس پندرہ ہزار یا کبھی اس سے بھی زیادہ لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پاتے ہیں۔ اِن اسکولوں میں عام طور سے ہر قسم کی مناسب تعلیم کا انتظام ہوتا ہے۔ سترہ سال تک لڑکے اور لڑکیاں انھیں اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ غیر معمولی جوہر اور کسی خاص علم کی طرف رجحان رکھنے والے بچے درمیان میں بھی ایک اسکول سے دوسرے اسکول میں جہاں اُس علم سے متعلق زیادہ اچھا انتظام ہوتا ہے، بھیج دیے جاتے ہیں۔ وہ طلبا جو آگے چل کر اور مخصوص علوم کے ماہر (Specialists) بنتے ہیں وہ اپنی لیاقت بڑھانے کے لئے یہاں سے دوسرے اسکول میں چلے جاتے ہیں ورنہ معمولی طور سے یہیں تعلیم ختم کر کے طلبا اپنے اپنے مخصوص کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ تمام اسکولوں میں تعلیم و تربیت اور حفاظت کا نظم یکساں ہے۔ وشوامتر جی نے مزید پوچھنے پر کہا یہ سب باتیں آئندہ میں آپ کی آنکھوں کے سامنے آئیں گی'۔

اب ہم موتی ہاری پہنچ گئے تھے۔ یہاں کی پرانی باتیں      خواب و خیال ہو گئی ہیں۔ بالکل دنیا ہی بدل گئی ہے۔ آبادی تو اب صرف دس ہزار رہ گئی ہے۔ لیکن آج کل کی صفائی، حُسن، اور یکسانیت پہلے کہاں تھی۔ پہاڑی علاقہ سے نکلنے کے بعد ہی ہم جمہور مل میں آگئے تھے۔ موتی ہاری      اس جمہور کا ایک ضلع ہے۔ صوبوں کے ناموں میں بھی بہت کچھ ترمیم نظر آتی ہے۔ پرانا ضلع سارن اسی صوبہ میں ہے۔ اس کے مغرب میں کاشی کوشل، لکھنؤ سے آگے تک چلا گیا ہے۔ اس کے بعد کرو۔ پنچال۔ متسیہ۔ شورسین۔ نام کے گڑھ ہیں۔

دلی اب بھی ہندوستان کا دارالسلطنت ہے۔ اس طرح صوبوں اور علاقوں کے قدیم ناموں کو زندہ کیا گیا ہے۔ پچھلی صدیوں کے تاریخی مقامات کے نام بھی اُسی طرح چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ موتی ہاری میں ضلع کی پنچایت کا دفتر ہے۔ صدر اور ممبران حتی الامکان یہیں رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ضلع کی پیدائش اور ضروریات کے مطابق چیزیں باہر بھیجنے اور منگانے وغیرہ کا کام بہت اہم ہے۔ ضلع کے دفاتر کے کاغذات کے ساتھ پرانے کاغذات کا بھی یہاں ریکارڈ ہے۔ ضلع آفس کی عمارتوں کے علاوہ دوسرے تمام مکانات بھی یک منزلہ تھے۔ گاؤں اور شہر میں طرز تعمیر رہن سہن کھانے پینے کسی بات کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ اب وہ پُرانی تنگ گلیاں اور گندے مکانات ناپید ہیں۔ ضلع کی پنچایت کی بیٹھک علٰحدہ عمارت ہے۔ ضلع والوں کا ٹاؤن ہال بھی علٰحدہ ہے۔ پورے ضلع میں صرف ایک چھاپہ خانہ ہے۔ جہاں ضلع کی ضروریات کے تمام کاغذات چھپتے ہیں۔ یہاں سب سے بڑا کارخانہ مشینوں کی مرمت کرنے اور پُرزوں کے بدلنے کا ہے۔

اب سڑک دونوں طرف دور دور تک باغ ہی باغ نظر آرہے تھے۔ میں نے آج ناشتہ میں امرود اور بیر کھائے۔ ایک ایک بیر ایک ایک چھٹانک کا تھا۔ اس پر تعریف یہ کہ گٹھلی کا نام نہیں۔ امرود میں بھی بہت تلاش کرنے پر شاید دو ایک بیج مل جاتا ہے۔ خوشبو اور مٹھاس کا تو کہنا ہی کیا تھا۔ وشوامترنے بتایا۔ "اب گھٹیا چیزیں پیدا ہی نہیں کی جاتیں"۔ یہ تمام باغات "بیر گاؤں" کے ہیں۔ اس گاؤں میں یہی کام ہوتا ہے۔ پھل سال بھر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا گاؤں کو کام بھی ہمیشہ ملتا رہتا ہے۔ دوسری طرف اس گاؤں میں جامن کے بھی باغ ہیں۔ بیر کی طرح جامن بھی بڑے بڑے اور مٹھاس اور خوشبو کے لحاظ سے بہترین ہوتے ہیں لیکن بیج کا پتہ بھی نہیں ہوتا۔ باغوں سے نکلنے کے بعد ایک بار پھر کھیت ہی کھیت نظر آنے لگے۔

بہت سے کھیتوں کی فصل تو کٹ چکی تھی لیکن بہت سے کھیتوں میں ابھی کوسوں تک پھولی ہوئی سرسوں نظر آ رہی تھی معلوم ہوا کہ یہ "تیل گاؤں" ہے۔ اِن کھیتوں میں پہلے تل کی فصل بوئی جاتی ہے اور بعد میں سرسوں کی۔ یہاں تیل کا بہت بڑا کارخانہ ہے۔ کھانے اور سر میں لگانے کے لئے تیل نکالنا یہاں والوں کا پیشہ ہے۔ میں نے کہا "اب تو ہر کام بجلی سے ہونے کے باوجود تیل سے کپڑے ضرور رنگ جاتے ہوں گے" دشوا ترنے کہا "نہیں۔ اوّل تو کام کرنے کے لئے علٰحدہ لباس ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ ایسا کام ہے کہ آدمی دور ہی دور رہتا ہے۔ تمام کام تو مشین اور نل انجام دیتے ہیں۔ تیل لے جانے کے لئے بہت سی گاڑیاں بھی اسٹیشن پر نظر آئیں جو پرانے زمانہ کی مٹی کے تیل کی گاڑیوں سے بہت مشابہ تھیں۔ میں نے پوچھا "خوشبودار تیل تو یہاں نہیں بنتا ہوگا؟" معلوم ہوا کہ خوشبودار تیل کے کارخانے۔ غازی پور، جونپور، قنوج وغیرہ شہروں میں ہیں۔ وہاں آس پاس کوسوں دور تک صرف پھولوں ہی کی کھیتی ہوتی ہے۔ تل وہاں دوسری جگہوں سے جاتا ہے۔ جس سے وہاں کے لوگ تیل نکالتے ہیں۔ اسی طرح معلوم ہوا کہ صابن بنانے کے بھی علٰحدہ گاؤں ہیں۔

اگلے اسٹیشن پر "اچار گاؤں" لکھا ہوا نظر آیا۔ یہاں اچار اور مربّے کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تیار ہوتی۔ اچار کے لئے پھل اور تیل اور مربہ کے لئے ضروری چیزیں مختلف گاؤں سے آتی ہیں یہاں مشینوں سے پھلوں کو کاٹ کر اُن کو خشک کرکے اچار تیار کئے جاتے ہیں۔ بعد ازاں انھیں بڑے بڑے گوداموں میں چینی کے بڑے بڑے حوضوں میں رکھتے ہیں۔ جب کھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو محفوظ گاڑیوں میں بند کرکے دوسرے مقامات پر روانہ کر دیتے ہیں۔ یہاں کے لوگ اچار بنانے کے فن میں بڑے ہوشیار ہیں۔ اُن کو اس کی باضابطہ تعلیم دی جاتی ہے۔ کٹھل، بڑھل، آم، جامن، آنولہ، گدم وغیرہ تمام پھلوں کے اچار بنتے ہیں۔ ہر پھل علٰحدہ علٰحدہ

گاؤں میں پیدا کیا جاتا ہے۔ اور تمام پھلوں کی خارجی شکل میں سائنس نے حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ آگے جانے کے بعد ہمیں "ورزی گاؤں" اور اس کے قریب ہی "دال گاؤں" ملا۔ دال گاؤں میں بارش کے موسم میں اُردو۔ مونگ اور جاڑے میں ارہر پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں دال تیار کرنے کا بہت بڑا کارخانہ ہے۔ باقی تمام چیزیں جیسی دوسرے گاؤں میں تھیں ویسی ہی یہاں بھی نظر آئیں۔ راستہ میں اور بھی کئی گاؤں ملے لیکن اُن سب میں قلمی آم اور لیچی کے باغات کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

یہ باغوں کا سلسلہ مظفر پور سے لیکر گنگا کے کنارے تک پھیلا ہوا ہے۔ پھلوں کے خواص میں حیرت انگیز تبدیلی ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی تبدیلی ہو گئی ہے کہ پھل سال بھر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ بہت سے درخت ایسے بھی ہیں جو سال بھر میں صرف دو بار پھل دیتے ہیں۔ لیچی اور آم کے پھلوں میں گٹھلی اب بہت چھوٹی سی رہ گئی ہے۔ ایسے بھی پھل پیدا ہوتے ہیں جن میں گٹھلی بالکل نہیں ہوتی۔ سارا بہار ایک لحاظ سے آموں اور لیچیوں کا باغ ہے۔ انگ، مگدھ، ودیہہ ان تینوں اضلاع میں سب سے زیادہ یہی پھل پیدا ہوتے ہیں۔ یہ پھل یہاں سے نہ صرف ہندوستان کے مختلف حصوں میں بلکہ امریکہ، یورپ اور ایشیا کے تمام حصوں میں روانہ کئے جاتے ہیں برف کی گاڑیوں میں وہ اس طرح روانہ کئے جاتے ہیں کہ مہینوں تک خراب نہیں ہوتے۔ اَمرس بھی یہاں تیار کیا جاتا ہے۔ اور اس کے بنانے اور محفوظ رکھنے کا ایسا انتظام ہے کہ کھائیے تو تازہ آم کا ذائقہ ملتا ہے۔ "دال گاؤں" سے تھوڑی ہی دور چلنے کے بعد اندھیرا ہو گیا۔ میں آگے کے گاؤں کے متعلق اپنے دوستوں سے سوالات کرتا رہا آٹھ بجے کھانا کھانے کے بعد اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ پوری ٹرین بجلی کی روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ اس کے بعد میں سو گیا۔ چار بجے جب میری آنکھ کھلی تو گاڑی گنگا کے پل پر رینگ رہی تھی۔ ہم اب مگدھ میں داخل ہو چکے تھے۔ اور پٹنہ یعنی راجہ اشوک کا

شہر آگیا تھا۔ میں نے جب اپنے سفر کے تمام مناظر کو سامنے رکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ آجکل کے لوگ گذشتہ زمانہ کے لوگوں سے کہیں زیادہ ہوشیار ہیں۔ گذشتہ زمانہ میں ہر شخص چاہتا تھا کہ دنیا کی تمام چیزیں وہ خود پیدا کرے۔ چنانچہ ایک ہی گاؤں اپنی ضروریات کی تمام چیزیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اب یہ ہے کہ ایک گاؤں کے ہزاروں آدمی ایک ہی چیز پیدا کرتے ہیں۔ "درزی گاؤں" کپڑا تیار کرنے والے گاؤں سے کپڑا لیتا ہے اور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے انواع واقسام کے لباس تیار کرتا ہے اور ضرورت کے مطابق مختلف مقامات پر روانہ کرتا ہے۔ کچھ آدمیوں کو کھانا پکانا پڑتا ہے لیکن اُس گاؤں کو اناج پیدا کرنے یا آٹے چاول کے بھاؤ سے کوئی غرض نہیں ہوتی ہے۔ نہ تو گائے بھینس پالنے سے کوئی واسطہ ہوتا ہے اور نہ آلو، بیگن گوبھی بونے سے کوئی مطلب۔ غرضکہ اس گاؤں کی تمام ضروریات کی چیزیں دوسرے گاؤں سے آتی ہیں۔ اُس گاؤں کی کپڑے سے متعلق تمام ضروریات کو "درزی گاؤں" پورا کرتا ہے۔ چونکہ تمام چیزیں مشینوں سے اور ایک ساتھ تیار ہوتی ہیں اس لئے وقت اور محنت بہت کم صرف ہوتی ہے۔ کہاں تو یہ تھا کہ دن رات محنت کرنے کے بعد اگر سر پر ٹوپی ہے تو پاؤں میں جوتا نہیں اور کہاں اب یہ کہ ہفتہ میں پانچ دن اور وہ بھی صرف چار گھنٹے روزانہ کام کر کے جنت کا عیش و آرام حاصل ہوتا ہے۔ پہلے زمانہ میں زندگی کی سب سے ابتدائی ضرورتوں (مثلاً کھانا، پینا، کپڑا وغیرہ) کی تشفی کے لئے انسان کی پوری محنت اور زندگی صرف ہو جاتی تھی پھر بھی وہ ضرورت کی چیزوں کے لئے ترستا رہتا تھا۔ دوسرے کاموں کے لئے مشکل سے لوگوں کو وقت ملتا تھا۔ اُس میں اُن لوگوں کا شمار یقیناً نہیں جن کی زندگی کا دارومدار دوسروں کی محنت پر تھا۔ اُس زمانہ میں انسان اپنی زندگی کا کوئی اعلےٰ نصب العین نہیں بنا سکتا تھا اس لئے کہ ہر قسم کی مشکلات اُسے گھیرے رہتی

تھیں۔ لیکن اب کایا پلٹ ہو چکی ہے صرف چار گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ باقی بیس گھنٹے سونے، پڑھنے، ناچنے گانے کے لئے۔ دوست احباب کی سوسائٹی سے لطف اندوز ہونے کے لئے، مخصوص علوم میں مہارت حاصل کرنے کے لئے فلاح وبہبود کے کاموں کے لئے غور وفکر اور ادبی مشاغل کے لئے مخصوص ہیں اِتنی چیزوں میں حصّہ لینے کے بعد بھی لوگوں کے پاس کافی وقت بچ رہتا ہے۔ سال میں نو مہینے کام کرنے کے بعد تین مہینہ بالکل فرصت رہتی ہے اور اُس وقت کو سیر وسیاحت میں صرف کیا جا سکتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی حصّہ میں اُسی آرام کے ساتھ جو گھروں میں حاصل رہتا ہے انسان ریل، جہاز یا ہوائی جہاز کے ذریعہ سفر اختیار کر سکتا ہے۔ اپنے اپنے مشاغل کے انتخاب میں بھی آزادی ہے۔ صرف صلاحیت اور قابلیت درکار ہے۔ پھر ہندوستان کا ایک آدمی جو انگور کی کاشت میں ماہر ہے اپنے کام کے سلسلے میں فرانس میں جا کر آباد ہو سکتا ہے۔

پٹنہ میں نالندہ جانے والی گاڑی کھڑی تھی۔ جس گاڑی میں ہم سوار تھے اُس سے آگے نہیں جاتی تھی۔ دوسرے ساتھیوں سے رخصت ہو کر میں اور وشوا تر نالندہ جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئے۔

## باب نہم

# نالندہ میں خیر مقدم

گاڑی فراٹے بھرتی نالندہ کی طرف رواں تھی۔ صبح کا وقت سورج اگرچہ ابھی افق مشرق پر نمودار نہیں ہوا تھا۔ لیکن اپنی آمد کا لفوف پیغام شفق کی سرخیوں سے بھیج رہا تھا۔ زراعتی اسکولوں کے درختوں کے سرے پر یہ سرخی ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے تاریک راتوں میں دور دہکتی ہوئی آگ کی سرخی اوپر ہی اوپر فضا کو روشن کر رہی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سورج اپنے آتشیں حسن سے رات کی تاریکی کو جلا دینے کے لئے ایک جگہ ٹھہر گیا ہے۔ اگرچہ ابھی سورج کا ہیکل نظروں سے اوجھل تھا لیکن اسکی آمد کی خبر پاکر طیور جاگ اٹھے تھے۔ ریلوے لائن کے دونوں طرف چنوں کے پودے دانوں کے بار سے جھکے ہوئے دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ جن میں کہیں کہیں کھیتوں میں پھیلی ہوئی تیلی تیلی لائنیں نظر آجاتی تھیں۔ میں نے دل میں سوچا اور تو سب کچھ ہے لیکن آج کے باشندوں کو چنے کا ہولا نصیب نہیں ہوتا ہوگا۔ لیکن بعد میں میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اسلئے کہ مجھے بعد میں ہولہ کھانے کا اتفاق ہوا۔ میرے ہمراہی اپنی ضروریات سے فارغ ہو چکے تھے۔ گاڑی میں کچھ لوگ کتاب پڑھ رہے تھے اور کچھ گا رہے تھے۔ باقی لوگ اپنی اپنی جگہوں پر خاموش بیٹھے خیالات میں غرق تھے۔ خیال کے اس داخلی سناٹے میں گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ خیال کی رو کا ساتھ دے رہی تھی۔ میں بھی اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر اور غسل کر کے اپنی سیٹ پر آبیٹھا۔ گاڑی اسکول کے حدود میں داخل ہو چکی تھی سامنے چاروں طرف دور دور تک کھیتوں سے گھری ہوئی ایک تین منزلہ خوبصورت عمارت کھڑی تھی۔ کچھ فاصلہ پر ایک دوسری چار منزلہ عمارت تھی جس میں چاروں طرف کھڑے ہوئے مکانات کے درمیان میں ایک بڑا آنگن تھا۔ مکان کے باہر پھول کے پودوں کی سجاوٹ حیرت انگیز اور دلکش تھی۔ رہنما نے بتایا کہ یہ

زراعت کا اسکول ہے۔ اور دوسری عمارت اسکا ہاسٹل ہے۔ اسی طرح تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بہت سے اسکول ہے۔ آخر ٹھیک ساڑھے چھ بجے گاڑی نالندہ کے بڑے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ نالندہ کا احاطہ بہت بڑا ہے۔ یہاں چار اسٹیشن ہے جو اپنے اپنے قریبی اسکولوں کے نام سے موسوم ہیں۔ اس بڑے اسٹیشن کا نام "نالندہ خاص" ہے۔

ہر گاڑی میں دوسرے مختلف انتظامات کے ساتھ لاسلکی ٹیلیفون بھی ہے۔ چنانچہ پچھلے اسٹیشن پر وشوامتر نے نالندہ یونیورسٹی کے سب سے اعلیٰ منتظم کو ہماری آمد کی دوبارہ اطلاع کردی تھی۔ گاڑی کے اسٹیشن میں داخل ہوتے ہی بگل کے ذریعہ میرے پہنچنے کا اعلان کیا گیا۔ پٹنہ میں سوار ہوتے وقت ہم لوگ دروازہ کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ چنانچہ گاڑی کے رکنے کے فوراً ہی بعد ہملوگ اتر پڑے پلیٹ فارم پر پرنسپل اور پچاس بڑے بڑے پروفیسر استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ میرے اترتے ہی وہ آگے بڑھے اور میرے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیا۔ اسٹیشن کے باہر اگرچہ موٹر کار ہمارا انتظار رہی تھی لیکن میں نے کہا اتنی دور کے لئے کار کی ضرورت نہیں۔ اسکے علاوہ سڑکوں بہ دو رویہ کھڑے ہوئے بچوں سے ملنے کی بھی سہولت رہیگی ہم لوگ "حامد ہاسٹل" کی طرف روانہ ہوئے۔ سڑک کے دونوں طرف قطار در قطار طلبا کھڑے تھے۔ یہ اونچے درجوں کے طلبا تھے۔ ایک اسکول کے طلبا، ایک ہی جگہ کھڑے کئے گئے تھے۔ ہم لوگ جب نزدیک پہنچتے تھے تو اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے میرا تعارف کرایا جاتا اس طرح ہم لوگ حامد ہاسٹل پہنچ گئے۔

حامد ہاسٹل کی زینت و آرائش قابل دید تھی۔ چاروں طرف دور تک پھیلا ہوا سبزہ نگاہوں پر ٹھنڈک برسا رہا تھا عمارت بہت اونچی اور سنگ مرمر کی طرح سفید تھی۔ اسکے چاروں طرف سنگ مرمر کی چھتریوں کے نیچے مرحوم پرنسپلوں اور ہیڈ ماسٹروں اور یونیورسٹی سے متعلق مشہور و معزز ہستیوں کے مجسمے کھڑے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر بیحد مسرت ہوئی کہ یہاں حضرت مسعودی کا بھی ایک بہت بڑا مجسمہ تھا۔ یہ وہی مشہور و معروف ہستی ہیں جنھوں نے نالندہ یونیورسٹی کو دوبارہ زندہ کرنے کیلئے اپنی تمام دولت و ثروت وقف کردی تھی انکی تمام منقولہ و غیر منقولہ جائداد پچیس لاکھ کی تھی۔ کوئی اولاد

نہ تھی۔ اسلئے انھوں نے یونیورسٹی کو وارث بنا کر اپنی تمام دولت اُسے بخش دی حضرت مسعودی نے دراصل اسوقت کے لحاظ سے غیر معمولی ہمت اور قربانی سے کام لیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میرے دل میں یونیورسٹی کی تجدید کا خیال پیدا ہوا تو جو خیال سب سے زیادہ میرے لئے باعث تکلیف تھا وہ یہ تھا کہ مجھ جیسا مفلس آدمی اتنے بڑے کام کی ذمہ داری لینے کے قابل نہیں ہے۔ میری دلی خواہش تھی کہ کوئی لائق اور ہونہار انسان اس کام کو اپنے ذمہ لے لیتا تو مجھے بھی اس کی حمایت اور پیروی کر کے یونیورسٹی کی خدمت کرنے کی مسرت حاصل ہوتی۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے فیاض آدمیوں کو اس بڑے کام کا کوئی خیال ہی نہیں تھا۔ علاوہ ازیں عام طور سے لاپرواہی پائی جاتی تھی لیکن اس ابتدائی وقت کے باوجود اپنی نااہلی کا احساس ہوتے ہوئے بھی میں نے اس کام میں ہاتھ ڈال ہی دیا۔ لیکن کامیابی کے لئے علماء و فضلاء کی مدد کیساتھ دولت بھی شرط تھی اُس زمانہ میں دولتمندوں کی کمی نہ تھی لیکن ان میں سے بہت سے تو اس کام کی اہمیت ہی نہیں سمجھتے تھے اور جو سمجھتے بھی تھے انھیں کامیابی کا یقین نہ تھا۔ جن لوگوں کو دولت خرچ کر کے عہدوں اور خطابات کی امید تھی۔ وہ میری مدد کیوں کرنے لگے تھے۔

میں نے بچپن ہی سے اگرچہ بھکشوؤں کی زندگی اختیار کی تھی لیکن مجھے بھیک مانگنے کی مشق نہیں تھی۔ یہ ایک اور دقت تھی۔ کچھ ہمت ور لوگوں نے میرا ساتھ دینا شروع کیا لیکن روپیہ کا سوال ویسے کا ویسا رہا۔ یعنی یہ تمام باہمت لوگ ایسے تھے جو اپنی ہمت اور ارادہ کے مطابق روپیہ نہیں خرچ کر سکتے تھے۔ پھر بھی انکا حوصلہ دیکھ کر مجھے بڑی تقویت ہوتی تھی۔ ایسے وقت میں حضرت مسعودی کے دل میں دفعتاً اس کام کو انجام دینے کا جذبہ پیدا ہوا۔ میں اُن سے متعارف نہیں تھا۔ اس سے پہلے کبھی انھوں نے ایسے کاموں میں ہاتھ بھی نہیں ڈالا تھا لیکن نہ معلوم دل میں یکایک کیا آیا کہ انھوں نے اپنی تمام دولت و ثروت میرے سپرد کر دی۔ کچھ دو صدی سے زیادہ کی بات کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ میری آنکھوں میں اب بھی وہ پرانے ساتھی پھر رہے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی یونیورسٹی کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دی تھی۔ اُسوقت کے لوگوں نے اُنکی قدر ضرور کی لیکن اتنی نہیں جتنی قدر کے وہ مستحق تھے۔" حامد ہاشمی"

نصف دائرہ کی شکل کا تھا۔ اس میں سوا لاکھ آدمیوں کی گنجائش تھی۔ بیٹھنے کی گیلریاں تفریحی ہال کے سامنے سے ہو کر آہستہ آہستہ اونچی ہوتی گئی تھیں۔ اگرچہ وہ تفریحی ہال کے سامنے نصف دائرہ کی شکل میں بہت دور تک چلی گئی تھیں لیکن وہ کچھ اس طرح بنائی گئی تھیں کہ دور و نزدیک کے تمام آدمی تفریحی ہال کو دیکھ سکتے ہیں ان گیلریوں کے نیچے اوپر تین منزلیں نظر آئیں بیٹھنے کے لئے لمبی لمبی کرسیاں اور جگہ جگہ پر بجلی کے لیمپ اور پنکھے لگے تھے۔ تفریحی ہال کی دھیمی سی آواز کو بھی سب سے آخر میں بیٹھا ہوا آدمی بھی مائکروفون کے ذریعہ سُن سکتا تھا۔ گیلری کی ہر منزل پر ہوا اور روشنی کے لئے دریچے اور جھروکے بنے ہوئے تھے۔ دیواروں پر دنیا کے قدیم اور جدید دور کی مقتدر ہستیوں کی تصویریں اور سنہرے حروف میں ان کی سوانح عمریاں آویزاں تھیں۔ ان تصویروں میں زیادہ تر تصویریں خود یونیورسٹی ہی کے طلبا اور پروفیسروں کی بنائی ہوئی تھیں۔ طالب علم لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے بیٹھنے کے لئے ہال میں سیٹوں کا انتظام تھا۔ نشست گاہ میں پہنچنے کے لئے سیڑھیاں باہر سے لگی ہوئی تھیں۔ صرف تفریحی ہال میں جانے کا راستہ سامنے سے تھا۔ تفریحی ہال کے بغل میں رقص گاہ تھی۔ جہاں افراد ناچ کی مشق کرتے تھے۔

یونیورسٹی کے لوگ بڑی تعداد میں میرا خیر مقدم کرنے کے لئے ہال میں جمع تھے۔ اسلئے پرنسپل نے مجھ سے وہاں چلنے کی درخواست کی۔ ناشتہ کا وقت قریب تھا۔ اسلئے تفریحی ہال میں مختصر الفاظ میں یونیورسٹی کی طرف سے مجھکو خوش آمدید کہا گیا اور گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا گیا۔ میں نے بھی مختصراً ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس بات پر اپنی خوشی کا اظہار کیا کہ میں پھر اپنی محبوب یونیورسٹی میں آگیا تھا۔ وہاں سے لوگ مجھے سیدھے یونیورسٹی کے مہمان گاہ میں لے گئے۔ یہ مہمان گاہ ایک بہت بڑی پانچ منزلہ عمارت تھی۔ اس میں ہزار آدمیوں کے قیام گاہ انتظام تھا کمروں وغیرہ کا انتظام بالکل اسی قسم کا تھا جیسا کہ سیب گاؤں میں۔ صرف فرق یہ تھا کہ اس کا آنگن بہت وسیع و عریض تھا۔ اوپر چڑھنے کے لئے لفٹ لگے ہوئے تھے۔ بجلی کے پنکھوں اور روشنی، اور پانی کے نلوں کا پورا انتظام تھا، مہمانوں کی خدمت اور آرام گاہ کے لئے بہت سے مرد اور عورتیں مقرر تھیں

خاص طور پر مہمانوں کے لئے اسی عمارت میں ایک باورچی خانہ اور طعام گاہ کا انتظام تھا۔ تیرنے اور نہانے کے لئے ایک بڑا سا حوض بھی تھا۔ عمدہ عمدہ کتابوں کا ایک ذخیرہ اور بیمار مہمانوں کے لئے ایک علٰحدہ اسپتال بھی ہے۔ اس طرح یہ مہمانوں کا ایک اچھا خاصہ گاؤں سا ہے۔ مہمان گاہ کے دروازہ پر ٹرام کار کھڑی رہتی ہے جو راجگیر تک پھیلے ہوئے مختلف علوم کے کالجوں تک چلی گئی ہے۔ مہمان جس کالج میں جانا چاہتا ہے۔ بس دروازہ ہی پر اُس کالج کو جانے والی ٹرام پر بیٹھ جاتا ہے۔ یونیورسٹی کی یہ عظیم الشان ترقی دیکھ کر میری مسرت کی انتہا نہیں تھی۔ میرے زمانہ کے مقابلہ میں اب بڑی بڑی تبدیلیاں ہو چکی تھی قیام گاہ پر پہنچنے کے بعد میں نے ناشتہ تیار پایا۔ وشوامتر، پرنسپل یوسف اور دوسرے خاص خاص پروفیسر مردوں اور پروفیسر عورتوں کے ساتھ ناشتہ کیا۔ ناشتہ کے بعد آج کا پروگرام "مکتب طفلاں" کی سیر قرار پایا۔

## باب دہم

# طریقۂ تعلیم اور مکتب طفلاں

دوسرے پروفیسران توناشتہ کے بعد اپنی اپنی جائے قیام پر چلے گئے۔ صرف میں، دنتواتر، پرنسپل یوسف اور مکتب طفلاں کی ہیڈ معلمہ اور اسکول کے وائس پرنسپل ویرا ساتھ چلنے کو رہ گئی تھیں۔ لڑکے اور لڑکیوں کے مکتب میں خبر پہنچ گئی تھی۔ روانہ ہوتے وقت طے ہوا کہ سب سے پہلے مکتب طفلاں میں چلنا چاہئے۔ دروازہ سے باہر آکر ہم لوگ ٹرام میں جا بیٹھے۔ مکتب طفلاں یہاں سے ایک کوس کے فاصلہ پر تھا۔ راستہ میں کہیں کہیں میدان، باغ اور مختلف علوم کے اسکول ملے۔ آج اسکول میں فرصت کا دن تھا۔ طلباء (لڑکے اور لڑکیاں دونوں) ادھر ادھر گھومتے ہوئے یا بیٹھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ہماری ٹرام میں اور بھی کئی لوگ سوار تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ یونیورسٹی کے مہمان تھے کوئی اپنے لڑکے یا لڑکی یا کسی رشتہ دار سے ملنے آیا تھا۔ کوئی یوں ہی اپنی سالانہ چھٹیوں گذارنے اور سیر و تفریح کی غرض سے آیا ہوا تھا اور کوئی کسی علمی تحقیق کے سلسلہ میں یہاں قیام پذیر تھا۔

آخر ٹرام لڑکے، لڑکیوں کے اسکول کے صدر دروازہ پر پہنچ گئی۔ ہم لوگ نیچے اُتر پڑے، تمام پروفیسر عورتیں گیٹ پر خیر مقدم کے لئے کھڑی تھیں۔ گیٹ کے سامنے ایک عالیشان تین منزلہ مکان کھڑا تھا جو نفاست اور خوبصورتی میں مکمل تھا۔ احاطہ کے اندر کئی عمارتوں کے علاوہ ایک وسیع و عریض باغ بھی تھا ٹھیک اُسی قسم کا جیسا سیب گاؤں کے "باغ طفلاں" میں تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ طالبعلموں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ ایک آزاد گاؤں سا معلوم ہوتا تھا۔ سونے کے کمروں سے ملحق باورچی خانہ، طعام گاہ، اسپتال اور سودی فانہ تھے۔ اندر بچّوں کے تیرنے اور نہانے کے لئے بہتے ہوئے پانی کا ایک تختہ حوض بنا تھا جس میں کبھی ڈباؤ پانی نہیں رہتا تھا۔ کہیں کہیں پر فوارے اور پھولوں اور لتر کی حسین تھیاں

بنی ہوئی تھیں۔ ہری ہری گھاسوں سے ڈھکے ہوئے وسیع و عریض کھیل کے میدان تھے۔ جاڑے کے دنوں میں نہانے کے لئے ایک بڑے مکان کے اندر گرم پانی کا حوض بنا تھا۔ تعلیم دینے کے لئے عورتیں مقرر تھیں۔ مکتب طفلاں میں ہر ایک لڑکے اور لڑکی کو تین سال رہنا پڑتا ہے۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قومی اصول کے مطابق تمام لڑکے لڑکیاں تین سال کی عمر کے بعد ماں باپ سے الگ کر کے اسکولوں میں بھیج دئے جاتے ہیں۔ پوری تعلیم تین درجوں میں منقسم ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا درجہ جو چار سال سے چھ سال کی عمر تک کے بچوں کے لئے ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کا درجہ سات سال سے چودہ سال تک کے لڑکے اور لڑکیوں کے لئے ہے۔ اس کے بعد نوجوانوں کا درجہ جو پندرہ سے بیس سال تک کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ہے۔ پہلے درجہ میں تعلیم عام طور پر ایک ہی ہوتی ہے۔ کتابوں کے ذریعہ تعلیم کا زیادہ دستور نہیں اگرچہ بچے اسی درجے میں حروف اور ہندسوں کو پہچاننے لگتے ہیں۔ اس درجہ کے آخری سال میں انھیں لکھنا پڑھنا بھی پڑتا ہے لیکن زیادہ تر تعلیم زبانی ہوتی ہے۔ ہر زیر تعلیم مضمون کو اس طرح دلچسپ بنا کر بچوں کے سامنے رکھا جاتا ہے کہ وہ خود اسکو جاننے کے لئے بیچین ہو جاتے ہیں۔ جس مضمون کیطرف بچے کا زیادہ رجحان ہوتا ہے۔ معلمہ اُسی کی طرف زیادہ توجہ دلاتی ہے۔ جتنی توجہ طلبا کی عام لیاقت بڑھانے میں صرف کی جاتی ہے اتنی ہی توجہ ان کی جسمانی نشو و نما کیطرف بھی دیجاتی ہے۔ اگرچہ طلبا کے کشتی کھیلنے کیلئے پیڑوں کے نیچے کئی اکھاڑے بنے ہوئے ہیں۔ جہاں مقررہ وقت پر یہ چھوٹے چھوٹے پہلوان تال ٹھونک کر اپنی طاقت کی نمائش کرتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر دوڑ دھوپ کے کھیلوں سے انھیں محنتی اور طاقتور بنایا جاتا ہے۔ کبڈی، فٹ بال وغیرہ کئی قسم کے کھیل یہاں رائج ہیں۔ ان کھیلوں کے قاعدے بتا کر بچوں کو ان کھیلوں کا خود انتظام کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اپنے مشاغل میں زیادہ اہلیت دکھانے پر بچے اپنے درجہ میں ممتاز حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اسکے علاوہ انھیں اپنے استادوں کی شاباشی بھی ملتی ہے۔ اشیاء کی شکل میں انعام واکرام نہیں دیے جاتے دس دس بچوں کی ایک ٹولی ہوتی ہے جن میں سے ایک کو وہ خود مانیٹر چنتے ہیں ہر ٹولی کے لئے الگ ایک سونے کا کمرہ ہوتا ہے۔ رات کو جب لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے بستر پر جا لیٹتے ہیں تو معلمہ

تاریخی ہستیوں کی کہانی سناتی ہے۔ ان کہانیوں میں سن یا تاریخ کا بکھیڑا نہیں ہوتا۔ صرف اتنا بتا دیا جاتا ہے کہ اشوک بدھ کے بعد پیدا ہوا تھا اور اورنگ زیب شاہجہاں کے بعد۔ کہانیوں کی زبان آسان ہوتی ہے اور طرزِ بیان ایسا ہوتا ہے کہ بچے آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ یہ کہانیاں تاریخ، سیر و سیاحت اور سائنس وغیرہ سے متعلق ہوتی ہیں۔ کبھی بچے انھیں خود بھی دُہراتے ہیں۔ کبھی معلّمہ اور بچے ساتھ مل کر کوئی گیت گاتے ہیں۔ طلبا کو تندرستی اور صفائی کے اصول بڑی توجہ سے بتائے جاتے ہیں۔ انھیں صرف خود کو نہیں بلکہ اپنے اردگرد چیزوں کو بھی صاف ستھرا رکھنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انھیں بخوبی بتا دیا جاتا ہے کہ صرف تمھارا صاف رہنا کافی نہیں ہے بلکہ آس پاس کی چیزوں کو بھی صاف رکھنا چاہئے۔ کمرے میں صفائی کر کے کوڑا کرکٹ دوسرے کے کمرے میں نہ پھینک دو، کسی کے وہاں کوڑا کرکٹ پڑا دیکھ کر خود اُسے ہٹا دو یا اُس شخص کی توجہ اس طرف دلا دو۔ انھیں بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے محبت کا سبق یاد کرنا سکھلایا جاتا ہے۔ بچوں کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دینے والی ہستیوں کی کہانی وہ بہت دلچسپی کیساتھ سنتے ہیں۔ معلّمہ ان کہانیوں کو بڑے شیریں اور دل لبھانے والے انداز میں سناتی ہے۔ بچے اکثر انھیں سنتے سنتے محبت اور ہمدردی کے مارے آنسو بہاتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔

بڑے بڑے آدمیوں کے مجسموں اور تصویروں کے ساتھ ساتھ جلیل القدر ہستیوں کی سوانح عمریوں کے فلم بھی دکھائے جاتے ہیں۔ بچے ان چلتی پھرتی اور بولتی ہوئی تصویروں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے اور سُنتے ہیں۔ کھیل میں بچے گھر بناتے، باغ لگاتے اور پنچایت کرتے ہیں۔ مشہور ستاروں اور ان کے مختلف برجوں اور اُن کے فاصلہ سے متعلق دلچسپ کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ زمین اور نظامِ شمسی کے مختلف سیاروں اور آسمان کی گردش کا راستہ بتایا جاتا ہے۔ ان کہانیوں سے انسان کے باہمی ربط و اتحاد کے تصور کو بچوں کے ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔ عجائب خانوں کے محفوظ کردہ پرندوں اور چرندوں کے ذریعہ بھی علم حیوانات سے متعلق بہت سی باتیں بتائی جاتی ہیں۔ اکثر اوقات بچوں کو علم حیوانات کے اسکولوں کے چڑیا خانوں میں لے جاتے ہیں جہاں وہ زندہ جانور دیکھتے ہیں اور معلومات حاصل کرتے ہیں۔ اگرچہ اس طرح چھوٹی عمر میں انھیں علوم سے آشنا کرا دیا جاتا ہے لیکن اس بات کا بہت خیال

رکھا جاتا ہے کہ بچہ اُس میں جسمانی یا دماغی محنت کا احساس نہ کرے۔ انھیں دلچسپ طریقوں سے بچّوں کو ریاضی کا ابتدائی درس بھی دے دیا جاتا ہے۔ صرف و نحو کی اصطلاحات جانے ہوئے بغیر زبانوں کے فصیح اور غیر فصیح ہونے کی بھی تین سالوں میں انھیں کافی تمیز ہو جاتی ہے۔ انیوں کو دلچسپی کی کمی بیشی کا احساس کرا کے انھیں اندر زبان کے حُسن و قبح کو پہچاننے کی مشق کرا دی جاتی ہے۔ "باغ طفلاں" کے اندر بچّوں کی اپنی حکومت ہے۔ بچّے اُس کی روزمرّہ کی تنظیم میں اپنی ذہانت اور ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہیں۔ "مکتب طفلاں" کے طلبا کا لباس جانگیہ، موزہ، جوتہ یا اور کوٹ یا کرتا ہے۔ جاڑے کے دنوں میں سر ڈھانکنے کے لئے گلوبند بھی پہنتے ہیں۔ کسی قسم کے زیور کا وہاں نام نہیں۔ لباس میں بیک وقت تین خوبیاں ہوتی ہیں۔ آرام، سہولت، خوبصورتی۔ اس لباس میں لڑکے اور لڑکیاں بڑے پھُرتیلے نظر آتے ہیں۔

ہماری آمد کے سلسلے میں اپنے اپنے مانیٹر کو سامنے کئے تمام ٹولیاں انتظار میں کھڑی تھیں۔ بچّوں کی پارلیمنٹ کے صدر اور وزیروں نے "انجمن طفلاں" کی طرف سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ میرے کہنے پر اکھاڑے کا کھیل دیکھنا طے پایا۔ بچّوں نے خود اپنی اپنی جوڑی چُن لی۔ ایسی دس جوڑیوں کو میں نے خود چُنا۔ اِن میں پہلے، دوسرے اور تیسرے ہر سال کے بچّے تھے۔ اکھاڑہ میں پہنچنے کے بعد پہلی جوڑی پہلے سال کے لڑکوں کی آگے آئی۔ ان کا نام کرشن اور ابراہیم تھا۔ اکھاڑہ میں پہنچنے سے پہلے ہی انھوں نے کپڑا اُتار کر کشتی کا جانگیہ چڑھا لیا۔ پہلے تو دونوں دور ہی سے پینترے بدلتے رہے آخر گتھم گتھا ہو گئے۔ لڑنے کے قاعدے بھی بتائے گئے ہیں کہ کامیاب ہونے کے بعد بھی کن کن حصّوں پر چوٹ کرنے سے ہار ہو جاتی ہے۔ ابراہیم نے کرشن کو آخر نیچے کر ہی دیا لیکن کرشن بھی ایک ہی تھا۔ ابراہیم چت کرتے کرتے ہار گیا لیکن وہ چت نہیں ہوا۔ جب وہ اُسے چت کرنے میں جھک رہا تھا تو کرشن نے موقع پر ایسی جھپٹ ماری کہ ابراہیم چاروں خانے چت ہو گیا۔ دیکھنے والے بچّوں کے مجمع نے خوشی کا اظہار کیا۔ اب دونوں الگ الگ کھڑے ہو گئے۔ ابراہیم ایک بار اور موقع دینے کی درخواست کی۔ کرشن نے کہا۔ بھائی ابراہیم کوئی پرواہ نہیں۔ ایک بار چت کر چکے دیا ہے

اگر اب کی تم نے پچھاڑ بھی دیا تو بھی ہم برابر رہینگے۔ اب دونوں تالی بجا کر پھر بھڑ گئے۔ اب کے ابراہیم نے واقعی کرشن کو زیر کر دیا۔ آخر دونوں کی جوڑی برابر کی شمار کی گئی۔ اس کے بعد دوڑ اور فٹ بال میچ ہوا۔ کچھ لڑکوں نے تیراکی کا بھی مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد ہم لوگ باغ کے اُس حصّہ میں گئے جہاں جلیل القدر ہستیوں کے مجسّمے نصب تھے۔ میں نے پہلے سال کے ایک طالب علم سے پوچھا "معلوم ہے ان میں مارکس کون ہے؟" اُس نے فوراً دوڑ کر مارکس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پوچھا "تم اِن کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" اُس نے مختصراً بچوّں کی سمجھ کے مطابق کئی باتیں بتائیں۔ خلاصہ یہ تھا کہ مارکس نے انسان کی خدمت کے لئے بہت سی تکالیف برداشت کیں لیکن منہ نہیں موڑا۔ ایک لڑکی سے جب میں نے ڈارون کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بھی ڈارون کے مجسّمہ پر ہاتھ رکھ دیا اُس کی کہانی سُنا ڈالی۔ اسی طرح نباتات اور حیوانات کے متعلق بھی میں نے سوال کئے۔ جواب بہت تشفی بخش ملے سب سے اہم یہ بات تھی کہ بچوں میں کسی قسم کا خوف یا ہچکچاہٹ کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ بچوّں کے سونے کے کمروں کی سیر کرنے کے بعد طعام گاہ اور اسپتال وغیرہ بھی دیکھا۔ آج دوپہر کا کھانا بھی بچوّں ہی کے ساتھ کھایا گیا۔ ہم نے بڑے شوق سے اُن کے گانے اور قصّے سُنے۔

اُن کی تعلیم ہری ہری گھاسوں پر پھل پھول سے لدے ہوئے درختوں کے سایہ میں اور طیور اور حیوانات کے چڑیا خانوں میں ہوتی ہے۔ لڑکیوں کی صفائی، خوبصورتی اور بے باکی دیکھ کر جب میں نے ان کا مقابلہ ہندوستان کی بیسویں صدی کی عورتوں سے کیا تو مجھے یہ تمام باتیں خواب سی معلوم ہونے لگیں۔ مردوں نے اُنکی صلاحیتوں کو نشو و نما پانے سے روک دیا تھا۔ اُن کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس سے اُن کا اپنا بھی نقصان ہے۔ میں نے سوچا۔ انھیں میں آخر اچھوتوں کی بھی، اولادیں ہوں گی۔ جنھیں اُس وقت کے لوگ اگر انسان کہتے تھے تو گویا بڑی مہربانی کرتے تھے۔ زیادہ تر انھیں جانوروں سے بھی بدتر سمجھا جاتا تھا۔ کتّے کو گود میں بٹھانے میں پس و پیش نہیں تھا۔ لیکن مجال کیا کہ قسمت کا مارا اچھوت پاس بھی پھٹک سکے۔ ایسے

کتنے کروڑوں آدمیوں کی بیش بہا زندگیاں برباد کر دی گئیں تھیں۔ ظلم و ناانصافی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اُن بدقسمتوں کو گاؤں کے کنویں کا پانی بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔ اور الزاموں کے ساتھ اُن پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا جاتا تھا کہ وہ میلا صاف کرتے ہیں وہ مُردہ جانور اُٹھاتے ہیں وغیرہ وغیرہ لیکن ان الزام عائد کرنے والوں کو یہ نہیں سُوجھتا تھا کہ جو لوگ سماج کی ایسی خدمت انجام دیتے ہیں جسے کرنے کے لئے اور لوگ تیار نہیں اور جن پر سماج کی صحت پاکی اور صفائی کا انحصار ہے اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے نہ کہ اُلٹا اُن سے بے عزتی کا برتاؤ کیا جائے۔ خیر اب وہ زمانہ خواب و خیال ہو گیا۔ اگرچہ وہ زمانہ ہزاروں سال تک قائم رہا لیکن آخر میں انسان نے محسوس کر لیا کہ دوسرے کو چھوٹا سمجھنے سے خود چھوٹا بننا پڑتا ہے۔ بس اب یہی دلی خواہش ہے کہ دنیا پھر اس خواب کو نہ دیکھے اور نشہ اور لالچ کا شکار نہ ہو۔

"مکتب طفلاں" کی سیر ختم ہوئی جو خواتین یہاں تعلیم دینے کی خدمت پر مامور ہیں اُن میں سب کی سب قابل اور فاضل ہیں۔

رفیق ویرا جس طرح لڑکیوں کے لئے نمونہ ہیں اُسی طرح بچوں کے لئے بہترین عارضی ماں ہیں۔ تمام چیزوں کا جائزہ لینے کے بعد تین بجے کے قریب ہم مہمان گاہ پر واپس آئے۔ دوسرے روز "مکتب نابالغاں" دیکھنا طے پایا۔ اس کے بعد بہت دیر تک یونیورسٹی کے گذشتہ دو صدیوں کے حالات پر گفتگو ہوتی رہی۔

## باب یازدہم

# طریقۂ تعلیم۔ مکتب نابالغاں

آج صبح ٹرام پر سوار ہو کر مکتب نابالغاں کی طرف چلے۔ یہ اور بھی دور یعنی دو کوس کے فاصلہ پر واقع تھا جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے "مکتب نابالغاں" میں آٹھ سال تک تعلیم دیجاتی ہے یعنی چھ سے چودہ سال کی عمر تک۔ اس میں دو دو سال کے درجے بنائے گئے ہیں۔ ہر درجہ کے لئے الگ الگ قیام اور تعلیم کا انتظام ہے۔ مکتب نابالغاں میں ادب، ریاضی، جغرافیہ، صرف و نحو اور تحریر، زراعت، تحفظ مویشی، وغیرہ مضامین کی مختصر سی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن یہ تمام مضامین ہر طالبعلم کے لئے لازمی نہیں۔ علوم کی طرف رجحان پیدا ہونے کے بعد وہ جس طرف چل پڑتے ہیں اسی طرف انھیں لے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اُن کے میلان طبع کے خلاف تعلیم نہیں دیجاتی چنانچہ اس درجہ میں داخل ہونے کے بعد تین سے پانچ سال تک سنسکرت یا فارسی عربی وغیرہ کی تعلیم دیجاتی ہے۔ ان زبانوں کے سکھانے کے لئے ایسا ماحول تعمیر کیا جاتا ہے (یہ پہلے بتایا جا چکا ہے) جہاں طالبعلم چھوٹے بچوں کی طرح زبان سیکھتے ہیں۔ یہ زبانیں زبردستی اُن کے سر پر لادنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ جب معلوم ہو جاتا ہے کہ لڑکے کا رجحان اسطرف نہیں ہے تو اُن کے سیکھنے پر زور نہیں دیا جاتا۔ مکتب نابالغاں میں داخل ہونے کے ساتھ ہی طالبعلموں کو کچھ روزمرہ کے کام بتا دیے جاتے ہیں۔

مکتب نابالغاں میں پہنچتے ہی وہاں بھی پروفیسر مرد اور پروفیسر عورتوں اور انجمن طلبا کی طرف سے میرا خیر مقدم کیا گیا۔ تمام لڑکے اور لڑکیاں قطاریں کھڑے تھے۔ سب کے بدن پر جانگیہ اور کرتا تھا۔ جاڑے میں سردی سے بچنے کے لئے گرم لباس، اور جوتہ اور موزہ بھی ملتا ہے۔ ہر درجہ کے

ایک الگ گاؤں آباد ہے۔ جہاں طعام گاہ اور جلسوں کے ہال کے بغل میں باورچی خانہ بھی ہوتا ہے یہاں بھی تیرنے اور نہانے کا حوض ہے اور اکھاڑوں اور دیگر کھیل کے میدانوں کا پورا انتظام ہے۔ عمارتیں تین منزلہ ہیں۔ اوپر جانے کے لئے لفٹ لگی ہوئی ہے۔ لکھنے پڑھنے، کتاب، کاغذ، روشنائی، اور روشنی وغیرہ تمام چیزوں کا مکمل انتظام ہے۔ پانچ بجے لڑکے سو کر اُٹھتے ہیں اور ضروریات سے فارغ ہو کر غسل کرتے ہیں پھر ناشتہ کرتے ہیں۔ کھانے کے لئے جو عام طور سے چار اوقات مقرر ہیں وہی مکتب نابالغاں کے لئے بھی ہیں۔ مکتب طفلاں کی طرح چھ اوقات نہیں ہیں۔ اساتذہ کی ٹریننگ کے لئے ایک الگ کالج ہے۔ بیٹھنے کے لئے بنچیں ہوتی ہیں۔

اصولاً اگرچہ مکتب نابالغاں سے باضابطہ تعلیم شروع ہو جاتی ہے تاہم مضامین کو دلچسپ بنانے میں پوری توجہ صرف کی جاتی ہے۔ ان درجوں میں خوبصورت اور دلکش زبان میں لکھی ہوئی کتابوں، ڈراموں اور نظموں کے ذریعہ تاریخ کی تعلیم کو بھی جاری رکھا جاتا ہے۔ ڈراموں کو لڑکے خود اسٹیج کرتے ہیں۔ سائنس اور جوتش سے متعلق تحقیقات کرنے و تجربات حاصل کرنے کی طرف اگر رجحان ہے تو دوربین اور خوردبین اور تجربہ گاہوں سے مدد لی جاتی ہے۔ زراعت، حفظان مویشی وغیرہ علوم کی زیادہ تر عملی طور پر تعلیم دی جاتی ہے۔ جس کے لئے کھیتوں اور مویشی خانوں کا انتظام ہے مکتب نابالغاں کے پہلے دو سال کے اختتام پر طلباء کو بین الاقوامی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے اُس وقت دیگر مضامین کی پہلے ہی کی طرح مادری زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ صرف لڑکوں کا قیام ایسے خلط ملط ہاسٹلوں میں ہوتا ہے جہاں تمام لوگ صرف بین الاقوامی زبان بولتے ہیں۔ یہ بین الاقوامی زبان دراصل اسپارینٹو (PARANTO) زبان کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اسپرانٹو میں جو اسم اشارہ مستعمل تھے اب انھیں ترک کر دیا گیا ہے۔ صرف پندرہ قاعدوں میں اُس کا تمام صرف و نحو ختم ہو جاتا ہے۔ تذکیر و تانیث، حروف ربط (PREPOSITIONS) اور لفظوں میں دو بدل کے متعلق کچھ اٹل قاعدے ہیں جن میں کہیں تبدیلی نہیں۔ واحد و جمع اور تذکیر و تانیث کے وہی قاعدے ہیں۔ لیکن بےجان چیزوں کے لئے (NEUTER GENDER) استعمال ہوتا ہے

تانیث کے تمام الفاظ کے آخری حروف "الف" یا "ی" یا "واؤ" ہوتے ہیں اور صرف جاندار اشیاء کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے (VOWELS) پر ختم ہونے والے الفاظ جاندار اشیاء کیلئے جب استعمال ہوتے ہیں تو مذکر کہلاتے ہیں۔ فعل کے سلسلے میں یہ قاعدہ رکھا گیا ہے کہ سیدھے سادے چار اقسام ہوتے ہیں۔ ماضی، مستقبل، حال اور فعل حکمی (IMPERATIVE MOOD) واحد و جمع کے وہی پرانے قاعدہ ہیں۔ متکلم، حاضر اور غائب کے بھی وہی قاعدے ہیں۔ الفاظ کے مادّے تمام زبانوں سے حاصل کئے گئے ہیں۔ پہلے پالی، پراکرت، جند، اور سنسکرت زبانوں میں جو مادّے ایک سے تھے انھیں چھانٹ کر الگ کر لیا گیا۔ اس کے بعد ان مادّوں سے یونانی، لاطینی اور المانی، عبرانی، روسی، سلاو (SLAV) اور کیلٹک (CELTIC) زبانوں کے مادّوں کا موازنہ کیا مقابلہ کیا گیا اور اُن میں جو مادّے تمام زبانوں میں مشترک نکلے انھیں اختیار کر لیا گیا۔ بین الاقوامی زبان میں انھیں مادّوں سے بنے ہوئے الفاظ اور افعال کو اختیار کیا گیا ہے۔ سائنس کی اصطلاحیں ایک یورپ کی زبانوں میں رائج تھیں انھیں کو قبول کر لیا گیا ہے۔ صرف اُن کے آخر میں تذکیر و تانیث کے مطابق تبدیلی کر دی گئی ہے۔ بین الاقوامی سیاسی معاملات اور سیر و سیاحت میں یہ زبان مستعمل ہوتی ہے۔ اسلئے مکتب نابالغاں میں نویں اور دسویں سال میں اس زبان کا سیکھنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ بین الاقوامی ہاسٹلوں میں میں نے تمام لڑکوں کو اسی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے پایا۔ دسویں سال کے لڑکوں نے میرے آنے کے سلسلے میں اپنی مسرت کا اظہار اسی زبان میں کیا۔ اس زبان کے بہت سے الفاظ اب میری سمجھ میں آنے لگے تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ اس زبان کا سیکھنا تمام ملکوں میں آسان ہے اسلئے کہ اسمیں دنیا کی تمام زبانوں کے مادّے ہیں۔ چین، جاپان، سیام، تبت اور برما وغیرہ ممالک میں بھی یہ زبان رائج ہے۔ ہندوستان میں ہر جگہ ہندوستانی زبان اس وقت مادری زبان ہے۔ پشاور سے بغداد تک فارسی، مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ یورپ کی زبانوں کی بھی یہی حالت ہے جو نہ صرف یورپ بلکہ افریقہ، امریکہ، آسٹریلیا اور دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی رائج ہے۔

یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ آجکل کے اصول تعلیم کا خاص مقصد یہ ہے کہ لڑکوں کے عام جذبۂ تلاش و تحقیق

ترقی دیکر اُنکے تعلیمی مقاصد کے حصول کو اُن کیلئے آسان کردینا۔ اسی لئے امتحان میں لڑکا جس موضوع کیطرف اپنا رجحان ظاہر کرتا ہے۔ اُسی طرف لیجانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دو صدیوں کے تجربے نے بتادیا ہے کہ تعلیم کا صحیح اصول یہی ہے۔ زبردستی ٹھونک بجاکر عالم بنانے کا اصول بعض اوقات سخت دقتیں پیدا کردیتا ہے۔ پرانے زمانہ کے لوگ خاص کر بیسویں صدی کے لوگ بھی عجیب تھے۔ جسطرح ماں باپ، اپنی اولاد کی خواہش اور مقاصد کو معلوم کئے بغیر بچپن ہی میں اُسکی شادی کردیتے تھے اسی طرح وہ یہ بھی پہلے سے طے کرلیتے تھے کہ میرا لڑکا وکیل ہوگا یا ڈاکٹر۔ اُسکا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اکثر اوقات لڑکے کو اپنی تعلیم رجحان کے مطابق تو کیا کونین کی گولی سے بھی زیادہ کڑوی معلوم ہوتی تھی اور اس کا کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکلتا تھا۔ لیکن اب معمولی تہذیب اور دنیاوی برتاؤ کا ضروری علم تو لڑکوں کو دیکھتے دیکھتے اور سنتے سنتے ہوجاتا ہے اور مختلف علوم کی تعلیم اُن کے رجحان کے مطابق دیجاتی ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ ریاضی اور علم نجوم کی طرف رجحان رکھنے والے لڑکے جتنی استعداد مکتب یا بالغاں میں حاصل کرلیتے ہیں اتنی بیسویں صدی کے اس موضوع کے ایم۔ اے بھی نہیں حاصل کرپاتے تھے۔ حساب، اقلیدس، جبر و مقابلہ، ٹرگونومیٹری، چلن کلن وغیرہ ریاضی کے تمام مضامین میں انکو پوری مہارت حاصل ہوجاتی ہے۔ وہ اپنے خاص مضمون میں ہر روز ایک نئے جذبۂ تلاش کے ساتھ مخمور رہتے ہیں۔ اُن کا پڑھا ہوا موضوع بہت کچھ سامنے موجود رہتا ہے۔ معمولی علم نجوم کی تعلیم تو انکو پہلے ہی دے دیجاتی ہے اور آگے چل کر ریاضی کے جس خاص مضمون کیطرف طبیعت پھرتی ہے اُسطرف وہ بڑی خوشی سے متوجہ ہوجاتے ہیں۔ ادب، زبان، تاریخ، جغرافیہ اور سائنس وغیرہ میں بھی یہی بات ہے چنانچہ کوئی لڑکا اِن مضامین کے سرسری علم سے بھی نابلد نہیں رہتا۔ کیونکہ عام برتاؤ میں، بات چیت میں، اور باہمی تعلقات میں اُن کی ضرورت ہوتی ہے۔ آگے چل کر اگر اِن مضامین میں معمولی استعداد حاصل کرنا مشکل معلوم ہوا تو وہ تھوڑی بہت محنت بھی کر ڈالتے ہیں۔ لیکن رجحان کے مطابق نہ ہونے سے وہ زیادہ دور تک نہیں جاتے۔ بیسویں صدی میں جس طرح کورس کے لئے کتابیں مقرر تھیں اسطرح اب نہیں ہوتا۔ طالبعلم کو کون سی کتاب پڑھنے کے لئے دینی چاہئے یہ پروفیسر کی خواہش پر منحصر ہے

جو اپنے علم کے رجحانات کا برابر مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ ہر رجحان کے طلبار کی علیحدہ ٹولی ہوتی ہے۔ جس سے وابستہ ایک پروفیسر ہوتا ہے۔ یہ پروفیسر اپنے خاص مضمون کا ماہر ہوتا ہے۔ تعلیم کے لئے ہر قسم کی آسانیاں اور سہولتیں فراہم رہتی ہیں۔ اس طریقہ تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم کی رفتار ہوائی جہاز کی طرح تیز ہے۔

مکتب نابا خاں کے تمام عمارات کا ہم نے جائزہ لیا۔ صرف اسی ایک مکتب کے پانچ بڑے بڑے گاؤں آباد ہیں۔ ہر گاؤں میں رہنے والوں کی ضرورت کی تمام اشیار مل جاتی ہیں۔ میں نے ہر جگہ یہ بات دیکھی کہ مکان ایک منزل سے زیادہ کا نہیں ہوتا لیکن یہاں یونیورسٹی کی تمام عمارتیں دو منزلہ، سہ منزلہ یا اس سے بھی زیادہ اونچی تھیں۔

طلباء کو کتابوں اور دیگر چیزوں کے رکھنے کے لئے علیحدہ علیحدہ الماریاں دے دی گئی ہیں۔ پڑھنے کے لئے الگ یونیورسٹی کی کشادہ اور عالیشان عمارت ہے۔ کھیلنے کودنے اڑنے اور تیرنے کے لئے بڑے بڑے میدان اور تالاب بنے ہیں۔ لڑکوں کا جسم دیکھنے ہی سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کی جسمانی نشوونما پر خاص توجہ صرف کی جاتی ہے۔ ہر ہر گوشہ کی سیر کرنے کے بعد دوپہر کا کھانا میں نے وہیں کھایا۔ چودہ سال کی عمر میں لڑکوں میں اتنی صلاحیت اور قابلیت پیدا ہو جاتی ہے جو بیسویں صدی میں گمان سے کہیں زیادہ قرار دی جاتی۔ لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیاں، موسیقی، تحریر، نرسنگ اور ادبیات کی طرف زیادہ رجحان رکھتی ہیں۔ لڑکیوں کی حالت دیکھ کر بیسویں صدی کے وہ لوگ بھی اپنے خیالات بدلنے پر مجبور ہو جاتے جنھیں عورت ذات میں کئی قسم کی جبلّی اور پیدائشی کمزوریاں نظر آتی تھیں۔ مجھے یہاں کے تعلیمی اصولوں کا مطالعہ کرکے اور یہاں کے اساتذہ اور طلبار کی قابلیت اور صلاحیت دیکھ کر یقین ہو گیا کہ اس عہد کے بنی نوع انسان کو بہت سی نعمتیں اس تعلیم کی بدولت ہیں۔ ایک طرف تو ہزاروں جھگڑوں اور مصیبتوں کی جڑ یعنی ذاتی ملکیت اٹھا دی گئی اور دوسری طرف ایسی تعلیم رائج کی گئی جو جملہ خوبیوں اور انسان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر دیتی ہے۔ پھر کیوں نہیں نوع انسان کی یہ دنیا فرشتوں کی دنیا سے بھی اچھی ہو۔

## باب دوازدہم

# طریقۂ تعلیم مکتب بالغاں

میں روزانہ یونیورسٹی کے دو ایک حصوں کا جائزہ لیتا رہا اور مسلسل بارہ روز تک اسی طرح سیر کرتے رہنے کے بعد گویا ایک بار میں سرسری طور پر تمام چیزیں دیکھ سکا۔ مکتب طفلاں اور مکتب نابالغاں میں جس طرح کئی مختلف موضوعات میں تعلیم دی جاتی ہے (اگرچہ اس میں طلباء کے عام میلان طبع پر پوری توجہ صرف کی جاتی ہے) ویسے مکتب بالغاں میں نہیں دی جاتی۔ روزمرہ کی ضروریات میں کچھ چیزوں کا علم لازمی ہے اس لئے ابتداء میں بھی ہونے سے پہلے دو درجوں میں کچھ تمام ضروری مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن مکتب بالغاں میں طالب علموں کے لئے مختلف موضوعات کے الگ الگ اسکول ہیں۔ طالب علم صرف اُسی مضمون کی طرف توجہ دیتا ہے جس کی طرف اُس کا مخصوص رجحان ہوتا ہے اور جس پر اُس نے پچھلے سالوں میں دوسرے مضامین کے مقابلہ میں زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ ایسے طالبعلم بھی ہیں جو کام کاج میں فائدہ پہنچانے والے علوم سے اس لئے ناواقف رہ جاتے ہیں کہ اُن کا رجحان اُن علوم کی طرف نہیں ہوتا اور اُن کو اُن میں محنت نہیں کرائی جاتی۔ لیکن ایسے طالبعلموں کی تعداد بہت قلیل ہے۔

نالندہ یونیورسٹی میں مختلف علوم کے پندرہ کالج ہیں جو علم آثار قدیمہ، علم نجوم، فلسفہ، سائنس، ادب، موسیقی، تحریر، سول انجینیری، طب، علم نباتات، علم حیوانات، علم زراعت، میکانی علوم، اصول تعلیم وغیرہ مختلف علوم کے ناموں سے موسوم ہیں پروفیسر اپنے اپنے مضمون میں ماہر و کامل ہوتے ہیں۔ انسانیات (ANTHROPOLOGY) کے کالج میں آثار قدیمہ کو پہچاننے

اور اُن کو اکٹھا کرنے کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔ بیسویں اور بائیسویں صدی کے درمیانی عرصہ میں بالو۔ اور سمندروں کی تہہ میں پڑی ہوئی چیزیں کثرت سے دریافت کی گئی ہیں۔ بہت سی قدیم قوموں کے مذہب، اُن کے خیالات و اطوار اور تاریخ پر ادھر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہندوستان مصر، اسور، کلدان، ایران، میکسیکو، برازیل وغیرہ ممالک کے قدیم تہذیب و تمدن سے متعارف کرانے والی بہت سی چیزیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ملک نے ان چیزوں کے حاصل کرنے اور اُن کی حفاظت میں کسی قسم کی فروگذاشت نہیں کی ہے۔ جہاں قدیم کھنڈرات کو کھودنے میں اور چیزوں کو حفاظت سے رکھنے کے لئے عمارتیں تعمیر کرنے میں لاکھوں آدمی لگے رہتے ہیں۔ وہاں ہزاروں عالم رات دن اُن کی حقیقت کو منکشف کرنے میں منہمک رہتے ہیں۔ ہندوستان کے قدیم تمدن اور تاریخ کو اُجاگر کرنے کے لئے وسط ایشیا، تبت، ہمالیہ، جاوا، بالی، سیام، سماترا اور لنکا جیسے ممالک کو چھان مارا گیا ہے۔ اس کام میں کامیابی کا تمام تر سہرا نالندہ کالج کے سر ہے۔ علم انسانیات کے کالج کے ساتھ یہاں آثار قدیمہ کا بھی بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ یہاں نہ صرف قدیم ہندوستان اسور، میکسیکو، مصر وغیرہ ممالک کے آثار قدیمہ محفوظ ہیں بلکہ دنیا کے دوسرے عجائب خانوں کی چیزوں کی نقل بھی محفوظ رکھ لی گئی ہے۔ خود نالندہ کالج کی بہت سی پرانی چیزیں جمع ہیں۔ یہاں کی تاریخی چیزیں جو پہلے دوسرے ممالک کے عجائب خانوں میں چلی گئی تھیں، وہ بھی اب واپس منگائی گئی ہیں۔ عجائب خانہ کی عمارت آٹھ منزلہ ہے اور بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ زبانوں کی تعلیم کا نیا طریقہ ایسا آسان ہے کہ اُس سے اور بھی بہت سی دقتیں دور ہو گئی ہیں۔ علم انسانیات اور آثار قدیمہ کے محقق طلباء کو پہلے اُن زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے جن کے بغیر وہ آثار قدیمہ سے متعلق صحیح تحقیق و تفتیش نہیں کر سکتے۔

علم نجوم کا کالج راجگیر میں ہے۔ اس سے ملحق ایک بہت بڑی تجربہ گاہ ہے جو وہاں کے بیبھار گری چوٹی پر واقع ہے۔ بیبھار گری کی اب بالکل کایا پلٹ ہو گئی ہے اور

جانے کے لئے بہت اچھی سڑک بن گئی ہے جس کے دونوں طرف درخت لگے ہیں۔ تجربہ گاہ میں کئی دوربینیں ہیں جن میں ایک تو دنیا کی تین سب سے بڑی دوربینوں میں سے ہے جس میں سیارے لاکھ گنے بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہاں کا "رنگ بین" (SPECT-ROSCOPE) بھی بہت طاقتور ہے۔ لاسلکی کا یہاں ایک بہت بڑا اسٹیشن ہے۔ اب مشتری کے متعلق بہت زیادہ معلومات حاصل ہوگئی ہیں۔ وہاں سے اب گفتگو کا سلسلہ بھی قائم ہوگیا ہے بالکل اُسی طرح جس طرح دنیا میں ایک جگہ کے لوگ دوسری جگہ کے لوگوں سے گفتگو کرلیتے ہیں۔ پہلے ایک دوسرے کی زبان سمجھنے میں دقت ہوتی تھی لیکن اب وہ بھی جاتی رہی اگرچہ وہاں دن بدن بارش اور پانی کی کمی ہوتی جارہی ہے اور کرۂ مشتری اپنی جدّت اور قوت حیات رفتہ رفتہ کھورہا ہے جس کی وجہ سے وہاں کے لوگ بہت فکرمند ہیں پھر بھی انھوں نے اس سلسلہ میں آئندہ کے لئے بہت کچھ انتظام کرلیا کرلیا ہے ایک طرف تو زراعت کو ترقی دینے کے لئے نہروں کا جال سا بچھادیا گیا ہے۔ دوسری طرف آبادی کا اضافہ بھی روک دیا گیا ہے۔ روک ہی نہیں دیا گیا بلکہ اب آبادی کو کم کرنا شروع کردیا گیا ہے۔ وہاں کے لوگ اس کوشش میں ہیں کہ کسی نئے سیارے میں جابسیں لیکن ابھی تک اس کی کوئی صورت نہیں نظر آتی۔ کرۂ ارض کے باشندے بھی ان کی دقتوں کو دیکھ کر خاموش نہیں ہیں، وہ بھی اس کا حل تلاش کررہے ہیں بعض لوگ یہ پیشین گوئی کرنے لگے ہیں کہ وہ وقت قریب ہے جب انسان ایک سیارے سے دوسرے سیارہ میں جاسکے گا۔ اگر ایسا ہوسکا تو ہماری اپنی دنیا کی برادری اور بھی بڑھ جائیگی۔ جب ایک سیارہ ٹھنڈا ہونے لگے گا تو لوگ اُسے چھوڑ کر پہلے ہی دوسرے سیارہ میں جابسیں گے۔ بے بھارگری کی چوٹی پر تجربہ گاہ سے متعلق بہت سی عمارتیں تعمیر ہوگئی ہیں۔ پانی اور بجلی کا بھی اوپر ہی معقول انتظام ہے جس سے وہ اور بھی آرام دہ مقام ہوگیا ہے۔ فلسفہ کا کالج یہاں سے دو کوس کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں ہندوستانی

مادی اور مابعد الطبیعاتی فلسفہ ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے فلسفیانہ نظریوں اور مسلوں کا مطالعہ کرایا جاتا ہے۔ پرنسپل یوسف خود اس مضمون کے بہت بڑے عالم ہیں۔ اُن کا بہت سا وقت فلسفہ کے پڑھنے میں صرف ہوتا ہے۔ مختلف علوم کے کالج ایک دوسرے سے دور دور پر واقع ہیں۔ اُن کے درمیان یا تو میدان ہے یا آم لیچی کے کوسوں تک پھیلے ہوئے باغات ہر کالج میں کتابیں آلات اور ضرورت کی تمام دوسری اشیاء وافر طور پر مہیا ہیں۔ شعبۂ کیمیا کے کالج میں اگر بڑی بڑی کیمیائی تجربہ گاہیں ہیں تو۔ علم نباتات اور علم حیوانات کے کالج بڑے بڑے نباتاتی باغات (BOTANICAL— GARDENS) اور چڑیا خانوں سے مزین ہیں۔ اس طرح مختلف کالجوں میں علوم کی مکمل تقسیم ہو جاتی ہے۔ ہر کالج کا اپنا ایک ہوسٹل ہوتا ہے جو اُس کے قریب ہی واقع ہوتا ہے۔ یہ ہاسٹل کیا ہیں پورے پورے گاؤں ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کے ہاسٹل اور کالج ایک ہی ہیں۔ مرد و عورت کا امتیاز اور فرق بالکل یونیورسٹی کی

ان مختلف اور علٰحدہ علٰحدہ آبادیوں میں کھانا پکانے، صفائی قائم رکھنے اور مشینوں وغیرہ کی مرمت کے لئے کچھ اور لوگ مقرر ہیں جن کی علٰحدہ آبادیاں ہیں۔ لڑکوں کے کپڑوں کی سلائی اور دُھلائی کے گاؤں بھی الگ ہیں۔ گائے گاؤں بھی قریب ہی لیکن یونیورسٹی کے حدود سے باہر ہیں۔ یونیورسٹی کی کتابیں چھاپنے کے لئے جو نالندہ پریس پہلے کھولا گیا تھا اب اس کا کام بہت بڑھ گیا ہے مختلف علوم کے یہاں سے کئی ماہوار رسالے نکلتے ہیں۔ نالندہ کے پُرانے اِستوپوں (STUPAS) اور عمارتوں کو خاص طور پر محفوظ رکھا گیا ہے۔ بھیرو جی کے نام سے مشہور بُدھ کے مجسمہ پر ایک بہت اچھی چھتری لگ گئی ہے۔ جس کے سایہ میں وہ بڑا سا خوبصورت اور خاموش و پُرسکون مجسمہ اب اور بھی زیادہ دلکش معلوم ہوتا ہے۔ اُس کے نزدیک بڑا سا استوپا (STUPA) اب نیا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے پاس اکبر پور نام کا ایک

گاؤں تھا جس کا اب نام و نشان نہیں۔

مکتب بالغاں اور کالج کی تعلیم ختم کر کے اور زیادہ پڑھنے والوں کے درجہ میں ہندوستان سے باہر کے ممالک، مثلاً لنکا، برما، سیام، جاوا، چین، جاپان، تبت وغیرہ کے طلبا بہت کافی تعداد میں ہیں۔ نالندہ کے تعلیم یافتہ ان ممالک میں بڑے بڑے تعلیمی عہدوں پر فائز ہیں۔ دنیا میں کوئی علم نہیں جس کی اعلیٰ تعلیم کا اس یونیورسٹی میں انتظام نہ ہو اور دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو گا جہاں نالندہ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ نہ موجود ہوں۔

# باب سیزدہم
# نظام حکومت

نالندہ کے دوران قیام میں اور باتوں کے ساتھ ساتھ میں نے آج کل کے نظام حکومت سے متعلق بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں پروفیسر وشوامتر نے میری بڑی مدد کی اب تک کی باتوں سے یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ دنیا میں ہر جگہ اب مساوات کا راج ہے۔ مذہب، ذات پات، دولت، قومیت اور رنگ و نسل کے نام پر جتنے تعصبات اور مظالم برتے جاتے تھے اب اُن کا نام و نشان بھی مٹ گیا۔ اب تھوڑے سے لوگ بہت بڑی انسانی آبادی کو اپنے پیروں تلے کچل نہیں سکتے۔ اب تمام انسان برابر ہیں۔ مرد و عورت بھی یکساں حقوق کے مالک ہیں۔ ہر جگہ محنت اور معاوضہ کا اصول یکساں ہے۔ نہ اب دنیا میں زمیندار ہیں۔ نہ سیٹھ ساہوکار نہ راجہ اور رعیت، نہ دولت مند اور نہ مفلس۔ اونچ نیچ کی تمام تفریقیں مٹ گئیں ہیں۔ ساری دنیا میں ایک ہی نسل انسانی ہے اور دنیا کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ دولت اس ایک نسل انسانی کی جائداد اور ملکیت ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں جن اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے ان کے پیدا کرنے اور جمع کرنے میں اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق تمام لوگ لگے رہتے ہیں۔ تھوڑی سی محنت میں بہت زیادہ اشیاء پیدا کرنے کے لئے کام کی تقسیم کردی گئی ہے۔ بیسویں صدی کے انسان کو آج کل محنت کی تقسیم کا جو طریقہ ہے وہ بالکل عجیب سا معلوم ہوتا۔ اس زمانہ میں زندگی کی ایک بھی ضروری چیز شاید ہی ایک گاؤں بغیر دوسرے گاؤں کی مدد کے پیدا کر سکتا ہے۔ پہلے زمانہ میں ایک گاؤں مختلف قسم کے اناج،

ساگ اور ترکاریوں کے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی صنعتی چیزیں بھی پیدا کرلیتا تھا۔ لیکن آج کل کا گاؤں اس لحاظ سے عجیب وغریب ہے کہ ساخت آبادی اور اخراجات میں کئی گنا بڑا ہونے کے باوجود ایک بھی چیز پورے طور سے نہیں پیدا کرتا۔ اگر گیہوں ایک گاؤں میں پیدا ہوتا ہے تو آٹا دوسرے گاؤں میں پیسا جاتا ہے۔ اگر گنے کی کاشت ایک گاؤں میں ہوتی ہے تو چینی دوسری جگہ پیدا ہوتی ہے اگر کوئی گاؤں دودھ پیدا کرتا ہے تو گھاس دانہ دوسری جگہوں سے منگاتا ہے۔ اگر سلائی کرتا ہے تو کپڑا دوسری جگہوں سے آتا ہے۔ مشینوں کی ڈھلائی اور مرمت کا کام تو پہلے بھی خیر خاص خاص مقامات پر ہوتا تھا۔ آج کل کا انسانی سماج جس طرح زندگی کو آرام دہ بنانے والی تمام چیزوں سے بھرپور ہے وہ اسی تقسیم عمل کا نتیجہ ہے۔ ورنہ اتنی کثیر اشیا کی پیداوار میں نہ معلوم کتنا زیادہ وقت بے کار صرف ہوجاتا۔ آج صرف چار گھنٹہ کام کرکے انسان اپنی تمام ضروریات کی تکمیل کرسکتا ہے باقی بیس گھنٹے وہ زندگی کی مختلف مسرتوں کے حصول میں مصروف رہتا ہے لیکن اس تقسیم عمل کے بغیر یہ سہولت اس دور میں کیونکر ممکن تھی۔ اوزار اور مشینوں کا استعمال اگر نہ کیا جاتا تو اتنی اشیائے خوردنی کی پیداوار کیوں کر ممکن تھی۔ مشینوں کے بغیر اگر سارا وقت اسی ایک کام کے لئے وقف کردیا جاتا تو بھی یہ محال تھا۔ مشینوں اور اوزاروں کے استعمال کو زیادہ سودمند بنانے کے لئے یہ تقسیم محنت مناسب طریقہ سے عمل میں لائی گئی ہے۔ تقسیم محنت پہلے بھی عمل میں آئی تھی مگر اس دور کے انسان نے تقسیم محنت کی بنیادوں کو اور بھی وسیع کردیا ہے۔

پہلے زمانہ کے نظام میں انسانی قوت ایجاد و تخلیق تخریبی چیزوں کے بنانے میں صرف ہوتی تھی اور جب لڑائی چھڑ جاتی تب تو گویا اس تخریبی قوت تخلیق کا آتش فشاں پھوٹ پڑتا تھا۔

اس کے متعلق کچھ اور کہنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ حال کے نظام

حکومت کا کچھ ذکر کیا جائے۔ عالمگیر نظام حکومت گاؤں کے نظام حکومت کی ایک بڑے پیمانہ پر نقل ہے۔ گاؤں کی مجلس امور انتظامی میں (یا جسے مختصراً گاؤں سبھا کہہ لیجئے) ہر سَو آدمیوں پر ایک آدمی ممبر چُنا جاتا ہے۔ اگر کسی گاؤں میں پانچ ہزار آدمی ہیں تو وہاں کی گاؤں سبھا میں پچاس ممبر ہوں گے۔ اس چناؤ میں ووٹ دینے اور ممبری کے لئے کھڑا ہونے کا حق گاؤں کے ہر مرد و عورت کو یکساں طور پر حاصل ہے۔ بشرطیکہ وہ کسی دماغی یا جسمانی کمزوری کے شکار نہ ہو۔ یہ ممبر پھر ایک صدر اور سولہ ممبروں کی ایک مجلس عاملہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ اسی مجلس عاملہ میں گاؤں کی ضروریات کی تکمیل اور پیداوار کی دیکھ بھال اور تنظیم کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ گاؤں کے ہر قیام گاہ کی عمارت کا ایک نائک ہوتا ہے۔ ہر سَو خاندان پر ایک نائک منتخب ہوتا ہے ان سو خاندانوں میں زیادہ سے زیادہ دو سو افراد ہو سکتے ہیں۔ دو سو سے کم اس صورت میں ہو سکتے ہیں کہ شاید کچھ مرد و عورت غیر شادی شدہ ہوں۔ گاؤں کی مجلس عاملہ ان نائکوں سے اپنا بہت سا کام لیتی ہے اگر گاؤں کا امن و سکون خطرہ میں ہے یا کوئی اور خاص صورت حال ہے تو تمام لوگوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ مجلس عاملہ کی مدد کریں لیکن ان نائکوں کے ایسے مواقع پر خاص خاص فرائض ہوتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں پولیس جو کام انجام دیتی تھی وہ اب یہی نائک کرتے ہیں۔ کسی خاص وجہ کی بنا پر غیر حاضر رہنے کی صورت میں وہی کام معاون نائک انجام دیتے ہیں۔ گاؤں کے تمام افراد کو مختلف کاموں پر مامور کرنا مجلس عاملہ کی ذمہ داری ہے اور وہ یہ کام گاؤں سبھا کی رضامندی سے کرتی ہے۔ یہ گاؤں کی ضرورت کے مطابق طبیب، انّا، کتب خانے کے منتظم کار، مطبخ اور مودی خانہ کے منتظم کار، وغیرہ وغیرہ غرض تمام شعبوں کے صدر کا تقرر کرتی ہے۔ ہر ممبر کی رکنیت کی میعاد تین سال ہے یہی میعاد بین الاقوامی مجلس کے ممبروں کی بھی ہے۔ لیکن مجالس تعلیم کے ممبروں کے لئے یہ قاعدہ نہیں ہے۔ اِس طرح معلم یا معلمہ کو دائمی طور پر اپنے عہدہ پر رہنے کا حق حاصل ہے۔

بشرطیکہ اُس نے عوام کے نکتۂ نگاہ سے کسی بھاری جُرم کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ شروع میں بہت سے گاؤں کو ملا کر تحصیل یا سب ڈویژن سبھائیں اور کہیں کہیں تھانہ سبھائیں ہوتی تھیں۔ لیکن ان کو ٹوٹے سو سال سے زیادہ ہو گیا۔ گاؤں کی اعلیٰ تنظیم، برقی ذرائع آمد و رفت اور ٹیلیفون کی وجہ سے دراصل ضلع کا سائز اب تحصیل کے برابر ہو گیا ہے۔ جس طرح ہر نَو سَو آدمیوں پر ایک آدمی گاؤں سبھا کا ممبر منتخب ہوتا ہے اُسی طرح بیس ہزار پر ایک آدمی ضلع کی انتظامی مجلس کا ممبر منتخب ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ضلع پٹنہ کی آبادی دس لاکھ ہے اور یہاں کی مجلس انتظامیہ میں پچاس ممبر ہیں۔ ہر پانچ ممبروں پر ایک ممبر مجلس عاملہ کے لئے چُنا جاتا ہے۔ اس طرح پٹنہ ضلع کی مجلس عاملہ میں دس ارکان ہیں جن کے ہاتھ میں مندرجہ ذیل دس شعبے ہیں۔

(۱) تعلیم
(۲) صحت اور آبادی
(۳) امن و امان اور انصاف
(۴) مالیات
(۵) دوسرے ضلعوں اور مقامات سے لین دین
(۶) زراعت اور صنعت
(۷) مشین اور مجرموں کی اصلاح
(۸) ڈاک، تار، ریل، ہوائی جہاز
(۹) صیغۂ آثار قدیمہ اور تاریخ
(۱۰) پریس

چناؤ سے پہلے ضلع کے گاؤں سبھاؤں کی طرف سے امیدواروں کے نام آتے ہیں جنھیں عام لوگوں کی اطلاع اور غور و خوض کے لئے چناؤ کی تاریخ سے پہلے ہی مشتہر کر دیا جاتا ہے۔

مقررہ تاریخ کو ہر گاؤں میں ایک ہی دن اور ایک ہی وقت پر ووٹ لیا جاتا ہے۔ جس کے بعد سب سے کثیر ووٹ پانے والے مردوں اور عورتوں کے نام مشتہر کردئے جاتے ہیں۔ نااہل ثابت ہونے پر اس ممبر کو ہٹا دینے کا حق رائے دہندگان کو پورے طور پر حاصل ہے۔ ہر ممبر کا حلقہ انتخاب علیحدہ ہوتا ہے۔ ضلع ٹینہ میں اس قسم کے پچاس حلقے ہیں۔ ضلع کے صدر مقام کے باشندوں کا خاص کام ضلع کے تنظیمی امور کا انجام دینا ہے۔ لکھائی چھپائی کا کام کاغذات کو حفاظت سے رکھنا، اور مختلف تنظیمی شعبوں کے کام سب وہیں انجام پاتے ہیں۔ ہر تیسرے سال ضلع کی مجلس انتظامیہ کے ارکان بدل جاتے ہیں لیکن مختلف شعبوں کے دفتروں کے کارکن اور دوسرے کام کرنے والے نہیں بدلتے۔ مجلس عاملہ کے ممبر اپنی میعاد بھر ضلع کے دارالسلطنت میں رہتے ہیں۔

ضلع کے پہلے اور دوسرے تنظیمی شعبوں کا کام تو اُن کے ناموں ہی سے ظاہر ہے امن و امان اور انصاف کے شعبے گاؤں کے امن و امان کی حفاظت کرتے ہیں اور عدالت کا انتظام اور مجرموں کی مناسب سزا اور اصلاح کا کام انجام دیتے ہیں۔ ذاتی ملکیت کے ختم ہو جانے سے اب دیوانی کا لفظ ہی اُٹھ گیا ہے اس لئے عدالت کے نام سے مراد ہے صرف فوجداری کچہری۔ جس طرح دنیا سے بہت سی اشیاء کی دوکانیں اُٹھ گئیں اسی طرح حکومت کی اسٹامپ فروشی، عملوں کی رشوت بازی، اور وکیلوں کا محنتانہ بھی اُٹھ گیا۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے اس "معزز" پیشہ کا اب ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ عدالت کی نشست ایک کھلے ہال میں ہوتی ہے۔ جس میں دو فاضل اور تجربہ کار جج بیٹھتے ہیں۔ ہر معاملہ اپنے گاؤں کی پنچایت سے جو گاؤں سبھا کی ایک کمیٹی ہوتی ہے ہو کر آتا ہے۔ گاؤں سبھا یا تو اپنا فیصلہ دے چکتی ہے یا ابتدائی تحقیقات کے بعد معاملہ کو ضلع کی عدالت میں بھیجدیتی ہے۔ مدعی اور مدعا علیہ کے گواہان بھی ہوتے ہیں اور جج خود بھی ہر بات کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مقدمات کی تعداد عام طور پر بہت کم ہوتی ہے۔ اس لئے عدالتوں میں چہل پہل نہیں ہے تمام مقدمے

توہین یا ہتک، مارپیٹ اور قتل، ان تین دفعات میں ختم ہو جاتے ہیں۔ پھانسی یا سزائے موت کا قانون اُٹھ گیا۔ اس کی بجائے مجرموں کو کسی جزیرہ میں قید کر کے معاشرتی زندگی کی راحتوں سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ جہاں اس کے مناسب علاج اور اصلاح کا معقول انتظام ہوتا ہے۔ لیکن جب اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ اب اس کے برتاؤ میں تبدیلی ہو گئی ہے۔ اور وہ سماج کے لئے خطرناک نہیں ہے تو اسے آزاد کر دیا جاتا ہے۔ جرائم کے قیدیوں کے لئے ہر صوبہ میں ایک جیل ہوتا ہے۔ جہاں مجرموں کی اصلاح کی جاتی ہے۔

پانچویں شعبہ کے ذمّہ یہ کام ہے کہ ضلع کی پیداوار کو ضرورت مند اضلاع میں بھیجتا رہے اور دوسرے اضلاع اور صوبوں سے ضروری اشیاء کو منگاتا رہے۔ باقی دوسرے شعبوں کے کام اُن کے نام سے ظاہر ہیں۔

کئی ضلعوں کے اوپر صوبہ کی مجلس انتظامیہ ہوتی ہے۔ ہر دو لاکھ آبادی پر اس کا ایک رکن منتخب ہوتا ہے۔ انتخاب سے پہلے نامزد کرنے کا طریقہ نیچے سے اوپر تک یکساں ہے بہار میں دو کروڑ مرد و عورت رائے دہندگی کا حق رکھتے ہیں۔ اس طرح صوبائی مجلس میں ایک سو ممبران ہیں۔ اس کی مجلس عاملہ بھی گاؤں اور ضلع کے مجلس عاملہ کی طرح دس شعبوں کے دس ارکان یا وزراء پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان کے کام بھی وہی ہیں۔ لیکن یہاں کام اور فرائض کا میدان زیادہ وسیع ہے۔ صوبہ کی عدالت، اپیل کی آخری عدالت ہے صوبائی مجلس عاملہ کے ارکان اور صدر کو صوبہ کے دار السلطنت میں میعاد بھر قیام کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے ارکان صرف مجلس کی نشستوں میں آتے ہیں۔

صوبوں کے اوپر مجلس ملکی ہے۔ مجلس ملکی میں ہر دس لاکھ پر ایک نمائندہ چُنا جاتا ہے ہندوستان میں اس وقت بیس کروڑ مرد اور عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ باقی پانچ کروڑ بیس سال سے کم اور طالبعلمی کے دور میں ہیں۔ پورے ملک کی مجلس عاملہ کے بھی دس ارکان ہوتے ہیں جنھیں میعاد بھر دلی میں رہنا ہوتا ہے آج سے دو صدی پہلے کی

طرح شملہ کا قیام ان بیچاروں کو نصیب نہیں۔ یہاں بھی تنظیمی شعبوں کی تعداد اتنی ہی ہے۔ صرف اُن کے کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔

اُس کے اوپر مجلس بین الاقوامی ہے جس میں ہر پچاس لاکھ پر ایک نمائندہ منتخب ہوتا ہے۔ مردم شماری سے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت دنیا کی آبادی ایک ارب اٹھاسی کروڑ ہے۔ جن میں اڑتیس کروڑ تو طلبا ہیں باقی ڈیڑھ ارب مرد و عورت ووٹ دینے کا حق رکھتے ہیں۔ مجلس بین الاقوامی کے تین سو ارکان میں سے چالیس ہندوستان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مجلس بین الاقوامی کی مجلس عاملہ میں پندرہ شعبے ہیں۔ مجلس بین الاقوامی کے صدر کو "صدر اعظم" کا لقب حاصل ہے۔ اس کی نشست جنوبی امریکہ کے برازیل ملک میں دریائے نازنگ کے کنارے "عالم نگر" نام کے ایک شہر میں ہوتی ہے جو خط استوا پر واقع ہے۔ اسے آباد ہوئے آج سو سال ہو گئے۔ جس روز بین الاقوامی نظام قائم ہوا تھا اُسی دن ایک عالمگیر سنہ کی بھی ابتدا ہوئی۔ چنانچہ یہ سال سنہ ۱۰۰ ہے مجلس بین الاقوامی کے ممبران عموماً ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں۔ صدر اعظم اور مجلس عاملہ کے ممبران اور شعبوں کے صدر اپنی میعاد بھر "عالم نگر" میں رہتے ہیں۔ "مجلس بین الاقوامی" کی کارروائی بین الاقوامی زبان میں ہوتی ہے۔ عالم نگر میں پچاس ہزار مرد و عورت رہتے ہیں۔ ان میں ہر ملک کے باشندے ہیں۔ یہ لوگ مختلف شعبوں کے دفتروں میں اور دیگر کاموں پر مامور ہیں۔ بین الاقوامی وزراء کے ہاتھ میں مندرجہ ذیل شعبے ہیں۔

(۱) تعلیم
(۲) صحت
(۳) امن و امان
(۴) مالیات
(۵) لین دین کی تنظیم

(۶) زراعت

(۷) صنعت و حرفت

(۸) مشین

(۹) تعمیرات

(۱۰) ڈاک، تار

(۱۱) ذرائع آمد و رفت

(۱۲) پریس

(۱۳) انسانی آبادی

(۱۴) آثار قدیمہ کے عجائب خانے

(۱۵) تاریخی اسناد

اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ آبادی میں زیادہ اضافہ نہ ہو اور اس میں پوری کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس شعبے کا تعلق ساری دنیا سے لے کر معمولی گاؤں تک سے ہے۔ ہر دسویں سال مردم شماری تو ہوتی ہی ہے اس کے علاوہ یہ انتظام ہے کہ دو ماہ سے زیادہ کے حمل کی اطلاع اور اعداد و شمار شعبہ کے رسالوں میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ دو مقاصد کے تحت یہ شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ آبادی کا اضافہ روکنا اور اُن لوگوں کو جو دق اور دائمی امراض کے شکار ہیں اولاد پیدا کرنے سے باز رکھنا اور ان دونوں مقاصد میں پوری کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ آج کل کوڑھ، مرگی، آتشک، بواسیر وغیرہ کے مریض نہیں پائے جاتے اس کی وجہ یہی بین الاقوامی انتظام ہے۔ ایسی چھوت کی بیماریوں کے مریضوں کو عام انسانی سماج سے پہلے الگ کر کے آرام سے رکھنے اور اُن کے علاج کا پورا پورا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس طرح انھیں اپنے چھوت سے مرض پھیلانے کا

موقع نہیں دیا جاتا۔ پھر اُن کی اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سائنٹفک طریقوں سے ختم کردی جاتی ہے۔ اس طرح نسل انسانی کے دائمی دشمن یعنی ان امراض کا جڑ سے خاتمہ کردیا گیا ہے۔ اس کے باوجود جب یہ دیکھا گیا کہ خاص اقدام کے بغیر انسانی آبادی کا اضافہ نہیں رُکتا تو ماہرین کی کمیٹی نے پہلے دنیا کی اوسط سالانہ آمدنی معلوم کی۔ جس سے پتہ چلا کہ اتنی آمدنی سے پونے دو ارب سے کچھ ہی زیادہ آدمی آرام کی زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ یہ بھی اعداد و شمار سے معلوم ہوگیا کہ کتنے لوگوں کی پیدائش سے مرنے والوں کی کمی پوری ہوتی رہے گی۔ اُس سے فاضل پیدا ہونے والے بچے صرف آبادی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اگر ہر شادی شدہ مرد یا عورت صرف دو یا تین اولاد پیدا کرے تو یہ اضافہ روکا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کو ختم کرنے کے طریقوں کا دوبارہ استعمال کیا گیا۔ ہر مرد و عورت کو ضعیفی میں آرام پہنچانے کا ذمہ مُلک پر ہے۔ اس لئے اولاد پیدا کرنے کی خواہش ویسے بھی کم ہوگئی ہے اور دریافت شدہ ترکیب سے صرف اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت ہی کو ختم کیا جاتا ہے جذبۂ جنسی اُسی طرح موجود رہتا ہے اور آدمی دنیا کی ایک بہت بڑی مسرت سے محروم نہیں ہوجاتا۔ چنانچہ اسے لوگ خود پسند کرتے ہیں۔ پہلے اکثر لوگ اس کے مخالف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اضافہ آبادی کو تو ضرور روکنا چاہئے۔ لیکن مصنوعی طریقوں سے نہیں۔ بلکہ ہر شخص خود اپنے اوپر قابو رکھے۔ لیکن زیادہ لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ اپنے اوپر قابو رکھنا اتنا آسان کام نہیں کہ ملک کا ہر آدمی اُس پر عمل کرسکے اور جب یہ بات ہے تو اس معاملہ میں تساہلی سے کام لینا آبادی میں اضافہ کرنے کے مرادف ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دوسری چیزوں کی طرح آبادی کا گھٹانا، بڑھانا بھی اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو دنیا اور ملک کی تنظیم میں حصہ لیتے ہیں اور اس بات پر ان کو اتنا ہی قابو حاصل ہے جتنا بجلی کے بٹن پر۔

## باب چہاردہم

# نالندہ سے روانگی

نالندہ میں پورے پندرہ روز قیام کرنے کے بعد میں نے اپنا سفر دوبارہ شروع کیا وشوامتر کو ماضی و حال کی دنیا کا پورا علم تھا اور وہ مجھ سے بھی اچھی طرح متعارف ہو گئے تھے۔ اس لئے میں نے انھیں کو اپنا ہمسفر بنانا چاہا۔ انھوں نے بھی بڑی خوشی کے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ نالندہ آتے ہوئے اگرچہ ہم پٹنہ سے ہو کر گذرے تھے لیکن رات ہونے کی وجہ سے ہم وہاں کی سیر نہیں کر سکے تھے۔ چنانچہ نالندہ سے روانہ ہو کر سب سے پہلے پٹنہ جانا طے پایا۔ سفر دن میں اختیار کیا گیا اس لئے راستہ کے مناظر سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ وشوامتر اس راستہ کے ہر ہر گاؤں سے واقف تھے۔ چنانچہ اُن کے ذریعہ اُن گاؤں سے متعلق بے شمار باتیں معلوم ہوئیں۔ نالندہ پٹنہ سے براہ راست ٹرین کے ذریعہ صرف دو گھنٹہ کا راستہ ہے۔ راستہ میں آم کے بہت سے باغ دیکھنے میں آئے۔ میں نے وشوامتر سے کہا کہ پٹنہ کا مالدہ اور لنگڑا آم پہلے بھی بہت مشہور تھے انھوں نے بتایا اب اُن کی سائز اور لذت دونوں میں ترقی ہوئی ہے۔ یہاں کے آم قطب شمالی سے قطب جنوبی تک دنیا کے تمام ممالک میں بھیجے جاتے ہیں۔ ودیہہ، مگدھ، اُنگ، یہ تینوں جمہوریں گویا دنیا کے آموں اور لیچیوں کے باغات ہیں۔ یہاں کی زیادہ تر زمین اور باشندوں کا زیادہ تر حصہ انھیں پھلوں کی کاشت میں مصروف رہتا ہے۔ تعریف یہ ہے کہ یہ دونوں پھل

سال بھر پکتے ہیں۔ رات دن ہزاروں ریل گاڑیاں برف میں آموں اور لیچیوں سے لدی ہوئی ایشیا اور یورپ کے مختلف حصوں میں روانہ ہوتی رہتی ہیں ریلوے لائن کا تسلسل آسٹریلیا اور دوسرے جزائر کو چھوڑ کر دنیا کے کسی حصہ میں نہیں ٹوٹتا۔ کاٹ منڈو (نیپال) دارجلنگ، سدیا ان تین راستوں سے ہمالیہ کو پار کرکے ریل تبت میں داخل ہوتی ہے تبت میں بہت دور تک ریل کا جال بچھا ہے۔ اب تبت کے باشندوں میں وہ گندگی اور وحشت باقی نہیں رہی۔ وہی کیا دنیا کا کوئی بھی انسان اب صفائی اور تہذیب کے اوصاف سے محروم نہیں ہے۔ تمام لوگوں کے لئے تعلیم اور آرام کا مکمل انتظام ہے۔ تبت سے منگولیا اور منگولیا سے التائی پہاڑ کو پار کرتی ہوئی سائبیریا تک ایک ہی ریلوے لائن چلی گئی ہے۔ منگولیا سے منچوریا اور چین کے دوسرے صوبوں میں بھی ریلیں گئی ہیں۔ پھر وہاں سے یونن ہوتی ہوئی انام، سیام اور برما میں داخل ہوتی ہیں۔ برما کا تعلق ریلوں سے چٹگام اور آسام کے صوبوں سے ہو گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ سرنگوں کے ذریعہ برما اور ملایا کو بھی ریلوے لائن سے ملا دیا گیا ہے۔ تبت سے مغرب کی طرف ترکستان کے شہر یارقند، کاشغر، تاشقند، سمرقند کو پھر افغانستان، ایران، ترکی اور عرب میں ایک ہی ریلوے لائن چلی گئی ہے۔ پھر کوہ یورال کو کئی مقامات سے یہ پار کرکے ریلوے لائن روس میں گھس گئی ہیں۔ قسطنطنیہ میں سمندروں کے اندر سرنگیں تعمیر کرکے ایشیا اور یورپ کو ملا دیا گیا ہے۔ فرانس اور انگلستان کے درمیان میں بھی سمندر کی سطح کے نیچے سرنگوں کے اندر ریلوے لائن بچھی ہے۔ نہر سوئز میں سرنگیں تعمیر کرکے افریقہ اور ایشیا کو ملا دیا گیا ہے۔ افریقہ میں بھی ہر جگہ ریلوں کا جال بچھا ہے گذشتہ صدیوں میں صحرا کی ریگستانی زمین کو پانی سے سیراب کرکے سمندر کے آس پاس کی لاکھوں مربع میل زمین کو زرخیز اور سرسبز کر دیا گیا۔ افریقہ کی آبادی اب پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے اس لئے کہ نصف یورپ کی آبادی وہاں منتقل ہو گئی ہے۔ اسکے ساتھ

ساتھ ایشیا کے بھی بہت سے لوگ وہاں جا بسے ہیں۔ لیکن اب ملک اور نسل کی وہ پُرانی تفریق نہیں رہی۔ تمام لوگ ایک خاندان کے افراد کی طرح رہتے ہیں، حبشی، یوروپین ایشیائی سب تعلیم و تہذیب کے اعتبار سے یکساں ہیں اور رنگ کے اعتبار سے بھی یکساں ہوتے جا رہے ہیں۔

اس طرح اس پُرانی دنیا میں یورپ ایشیا اور افریقہ کے ممالک کو ریلوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے متحد اور منسلک کر دیا گیا ہے۔ سائبریا سے آبنائے بیرنگ کو سُرنگ کے ذریعہ پار کرتی ہوئی ریل شمالی امریکہ کے صوبۂ الاسکا میں پہنچ جاتی ہے۔ پھر پورے کینڈا اور پورے شمالی امریکہ کو پار کرتی ہوئی میکسیکو میں داخل ہوتی ہے پھر پناما کو سُرنگ کے ذریعہ پار کرکے ریل جنوبی امریکہ میں گھس جاتی ہے اور کولمبیا، پیرو، برازیل، بولیویا، چیلی، ارجنٹائن، یوروگویا، پیٹےگونیا وغیرہ تمام حصّوں میں پھیلی جاتی ہے۔ اگرچہ اس طرح آسٹریلیا اور دیگر جزائر جزائر اور جاپان کو چھوڑکر دنیا کے تمام ممالک کو ریل سے جوڑ دیا گیا ہے۔ جہاز بھی آمدورفت کا آسان اور سہل ذریعہ ہے جس سے ایک ملک کی چیزیں دوسرے ممالک میں پہنچتی رہتی ہیں ان کے علاوہ دور دور کے سفر زیادہ تر ہوائی جہاز سے طے کئے جاتے ہیں۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی اب آباد علاقے ہوگئے ہیں جہاں لوگ گرمیوں میں یعنی چھ ماہ کے دن میں رہتے ہیں۔ علم نجوم کے ماہرین جو اجسام فلکی کے تعلقات سے واقف ہیں وہاں زیادہ جمع ہوتے ہیں۔ سفر ہوائی جہاز سے طے کیا جاتا ہے۔ آجکل کے لوگ تباح قطب، اسکاٹ کے علاوہ قصّے چاہے پہلے ہی پڑھ لیں جن میں بڑی بڑی قربانیوں کے تذکرے ہیں۔ لیکن انھیں گذشتہ صدیوں کی مشکلات کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہ تمام باتیں گدھ اور پٹنہ کے درمیان سفر کرتے ہوئے معلوم ہوئیں۔ آم اور لیچی کے باغات سے گذرتے ہوئے ہم لوگ آخر پٹنہ پہنچ گئے اطلاع پہلے ہی ہوگئی تھی۔ گدھ

کی مجلس تنظیم کے صدر کامریڈ یوسف دیگر ممبران کے ساتھ اسٹیشن ہی پر خیر مقدم کے لئے آگئے تھے۔ شہر دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ پاٹلی پتر تو الگ رہا بیسویں صدی کے بھی وہ آثار باقی نہیں رہے۔ پورے پٹنہ شہر میں صرف پندرہ ہزار آدمی رہتے ہیں اب پرانے زمانہ کی تنگ گلیوں اور سڑکوں کا نام و نشان بھی باقی نہیں ہے اور نہ تین منزلہ اور چار منزلہ عمارتوں کا پتہ ہے۔ رہائش کے مکانات گاؤں کی طرح ہیں۔ باغات اور درختوں کی بھی وہی افراط ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس مقام پر پہلے ہزار آدمی رہتے تھے اب مشکل سے وہاں پچاس سے لے کر سو آدمی تک رہتے ہیں۔ پٹنہ مگدھ کا دارالسلطنت ہے۔ یہاں بہت سے سرکاری دفاتر ہیں۔ یہاں کا چھاپہ خانہ بہت بڑا ہے۔ یہاں ایک وائرلیس اسٹیشن اور ایک بڑا سا ہوائی اڈہ ہے۔ یہاں کے تمام باشندے انھیں شعبوں میں کام کرتے ہیں۔

اگرچہ رہائش کے تمام مکانات یک منزلہ ہیں۔ لیکن دفاتر کی عمارتیں کئی منزلوں کی ہیں۔ کاغذات کا ریکارڈ جس عمارت میں محفوظ ہے وہ پچاس منزل کی ہے۔ سب سے اوپر والی منزل پر پہنچنا بہت دقت طلب بات ہے اس لئے لفٹ کا انتظام ہے۔ اس دفتر میں ملک کے تمام کاغذات بڑی حفاظت سے رکھے گئے ہیں۔ اُن کو آگ اور پانی سے بچانے کا پورا انتظام ہے۔ یہاں کے دفتر میں مگدھ کے متعلق صرف انگریزی عہد حکومت ہی کی نہیں بلکہ مسلمانوں کے وقت کی بھی بہت سی سندیں اکٹھی کی گئی ہیں۔ پٹنہ کی سب سے خوبصورت عمارت "اشوک محل" ہے۔ اس کا نقشہ نالندہ کے "طالب ہاسٹل" کا ہے لیکن یہ عمارت زینت میں اُس سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ دوسرے اس رات میں سونے اور سنگ مرمر کا بہت حسین کام ہے۔ بہر حال وسعت میں اتنی ہی ہے۔ تفریحی ہال کے اوپر بڑے بڑے سنہرے حروف میں لکھا ہے۔ "اشوک کے لئے سب سے بڑی فتح سچائی کی فتح ہے۔"

# باب شانزدہم

# جمہور

پٹنہ سے روانہ ہوکر میں نے موجودہ ہندستان کے جمہور میں دو دو چار چار دن قیام کیا۔ لیکن تمام مقامات کے لوگوں کو اور اُن کے طرز رہائش کو یکساں پایا۔ میں روزانہ اپنے روزنامچہ میں آس پاس کی چیزوں کے متعلق درج کرتا رہا ہوں لیکن یہاں اُن کا بیان کرنا اعادہ ہوگا اس لئے اُن کو چھوڑ دیتا ہوں۔ صرف سفر سے متعلق خاص خاص باتیں سرسری طور سے اور اختصار کے ساتھ پیش کر دوں گا۔

پٹنہ کے ساتھ ہی مگدھ جمہور کے حدود سے نکل کر میں کاشی جمہور کے دار السلطنت بنارس میں پہنچا۔ دیگر تبدیلیوں کے ساتھ بنارس بھی بڑا منقلب ہوگیا ہے۔ کاشی کا وہ پرانا ناز و انداز باقی نہیں رہا نہ تو کچوری گلی باقی رہی نہ اُس کی پوری گلیوں کا کوئی نام نہیں ہے۔ چوڑی چوڑی سڑکیں ہیں اور کھلی ہوادار جگہوں پر مکانات کی وہی شان ہے۔ جس کا اس سے پہلے بارہا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ اگر آج کوئی آدمی بیسویں صدی کے طرز کا یا اُس زمانہ کا بنا ہوا مکان تلاش کرے تو اُسے ناکامیابی ہوگی۔ جب میں "من کن کا" اور "دسا سو میدھ" وغیرہ اُس زمانہ کے مشہور گھاٹوں پر گیا تو اور بھی مایوسی ہوئی۔ اگرچہ غسل کرنے کے لئے بہت سے لوگ آتے ہیں۔ سیڑھیاں پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور صاف ہیں بجلی کی طاقت سے چلنے والی کچھ کشتیاں بھی گنگا میں ادھر سے ادھر آتی جاتی دکھائی دیتی ہیں لیکن اب وہ گھاٹ والوں

اور پنڈوں کی چہل پہل رخصت ہوگئی۔ اب وہ "گرو گرو" کے نعرے اور نہ وہ گھڑل اور ڈنڈے کا تماشا خواب وخیال ہوگیا۔ نایؤں اور مالیوں کا بھی پتہ نہیں۔ ظاہر ہے آجکل جب سکوں ہی کا پتہ نہیں تو ان کے غلاموں کا وجود کیسے رہ سکتا ہے نیز اب وسا سو میدھ کا بازار لگتا ہے اور نہ دشیشر گنج کا گولہ، نہ تو سانڈوں اور مسٹنڈوں کا پتہ ہے اور نہ سماج کی ستائی ہوئی بدقسمت عصمت فروش عورتوں کے کوٹھے جو اُس زمانہ میں "دال منڈی" میں کثرت سے تھے لوگوں کی رہائش کے مکان یک منزلہ ہیں۔ تاریخی مقامات کے چاروں طرف گھلے ہوئے میدان ہیں۔ مندروں کو اب صرف تاریخی آثار سمجھ کر محفوظ رکھا گیا ہے۔ روپیہ پیسوں کا چڑھاوا اور پوجا وغیرہ کا اب کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ سارے بنارس میں اس وقت پچیس ہزار مرد وعورت آباد ہیں۔ اگر پُرانے طرز کے مکانات ہوتے تو اتنے آدمی ایک کونہ میں آجاتے۔ لیکن چوڑی چوڑی سڑکوں اور یک منزلہ مکانوں اور باغات کی وجہ سے اتنی قلیل آبادی پورے پُرانے بنارس میں پھیلی ہوئی ہے۔

بنارس کے پاس دو اور مشہور بستیاں ہیں۔ ایک تو برنا ندی کے اس پار تین کوس کے فاصلہ پر "رشی پتن مرگ داؤ" جسے پہلے سارناتھ کہتے تھے دس ہزار کی آبادی ہے۔ یہاں مہانوں کی قیام گاہ کی عمارتیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ عقل ودانش کے مالک بدھ نے سب سے پہلے یہیں سے اپنے خطبات شروع کئے تھے اس لئے اس مقام کا بہت بڑا درجہ ہے۔ ساری دنیا کے مرد وعورت یہاں آئے ہیں۔ یہ مقام اب بہت خوبصورت اور دلکش ہوگیا ہے۔ پُرانے منہدم استوپا (STUPA) از سر نو تعمیر کئے گئے ہیں۔ دوسرا اہم مقام اسی نالہ کے اُس پار۔ کاشی یونیورسٹی ہے۔ پہلے کی بہ نسبت یونیورسٹی کا رقبہ اب بہت پھیل گیا ہے۔ اب پرانی تعلیم گاہیں اور پنڈتوں کے چلتے پھرتے اسکول باقی نہیں رہے۔ لیکن اس سے تعلیم کی توسیع میں کوئی کمی نہیں ہے۔ تمام علوم کی تعلیم پہلے سے بھی زیادہ بہتر طریقہ سے کاشی یونیورسٹی میں دی جاتی ہے۔ اس یونیورسٹی کا شمار دنیا کی

اعلیٰ درجہ کی یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ ادب اور فلسفہ کے سلسلے میں اس کی بڑی شہرت ہے۔ صوبۂ کاشی کا دارالسلطنت بنارس ہے۔ گیہوں کی کاشت اور آم امرود اور بیر کے باغات کی یہاں افراط ہے۔ یہاں یہ پھل بہت ہوتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ اس صوبہ میں چینی بھی بہت پیدا کی جاتی ہے۔ پہلے کی بہ نسبت نہریں اب زیادہ ہیں لیکن آبادی گھٹ گئی ہے۔

اندر پرست، وتسو، پنچال، سورسین، متسیہ، کورو، آزاد علاقے ہیں۔ سورسین اور متسیہ میں بیسویں صدی کی کئی ریاستیں بھی شامل ہیں اب اُن ریاستوں کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا۔ ہندوستان کا دارالسلطنت دہلی ہے۔ لیکن خاص شہر میں صرف پچاس ہزار کی آبادی ہے۔ صفائی اور خوبصورتی کے اعتبار سے یہ شہر خاص شہرت کا مالک ہے۔ پرانی عمارتیں اب تک محفوظ ہیں۔ یہاں سے گیہوں، چینی اور گھی، دوسرے مقامات پر روانہ کیا جاتا ہے۔ ترائی کی طرف کاغذ کے کارخانوں کے بہت سے گاؤں ہیں۔

پنجاب، کشمیر میں بھی کئی جمہوریتیں ہیں۔ ایک کا دارالسلطنت لاہور ہے۔ ٹیکسیلا یونیورسٹی نے پھر اپنی قدیم شہرت حاصل کرلی ہے۔ علم طب کے سلسلہ میں اسکی شہرت تمام دنیا میں پھیل گئی ہے گیہوں اور دیگر اناج اور چینی کے ساتھ ساتھ یہ علاقہ میوہ بہت پیدا کرتا ہے۔ شمال کیطرف پہاڑوں علاقوں میں بھیڑوں کے بہت سے گاؤں ہیں۔ اونی کپڑوں کے کئی بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ اُسی طرح بجلی پیدا کرنے کے بھی بہت سے مقامات ہیں۔

راجستھان میں جس میں قدیم راجپوتانہ کی تمام ریاستوں کے علاقہ شامل ہیں دو خاص تبدیلیاں ہوگئی ہیں۔ ایک تو وہاں ریاستوں کی پرانی تقسیم باقی نہیں رہی یعنی تمام ریاستیں ملاکر ایک کردی گئیں۔ دوسرے وہاں کی خشک اور مردہ ریگستانی زمین کو آبپاشی کے ذریعہ ہرے بھرے میدانوں میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ سندھ کی بڑی نہر بیکانیر کے گرم اور خشک بیلۂ زمین کو اب تروتازہ رکھتی ہے۔ اجمیر اس کا دارالسلطنت سندھ میں پھل اور اناج اور غلہ پیدا ہوتے

ہیں۔ دارالسلطنت کراچی جہاز اور ہوائی جہاز دونوں کا بڑا اڈہ ہے۔ یہاں سے میں کاٹھیاوار گجرات، مالوہ، بیدر اور مہاراشٹر میں گیا۔ تینوں علاقوں میں کپاس کی کھیتی بہت ہوتی ہے۔ کپڑوں کے کئی بڑے بڑے کارخانہ ہیں۔ پرانی ریاست حیدر آباد، شمالی مہاراشٹر، جنوبی مہاراشٹر کارناٹک اور آندھرا ان چار جمہوریتوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ ان صوبوں میں بھی کپاس اور کپڑوں کے بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ ساتھ ہی یہاں چاول اور چینی کی پیداوار بھی بہت کافی ہے۔ دراوڑ اور کیرالا کے علاوہ اب لنکا بھی ہندوستان ہی میں شامل ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ اڑیسہ، بنگال، آسام اور ہمالہ وغیرہ کے علاقے ہندوستان کے حدود میں شامل ہیں۔ ان تمام مقامات کی حالت بہت ترقی یافتہ ہے۔ باشندے امن و سکون کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان علاقوں میں بے شمار مقامات پر اسکول یونیورسٹیاں کھل گئی ہیں۔

## باب شانزدہم

# وہ چیزیں جو اب دنیا سے اٹھ گئیں

پہلے کسی نہ کسی طرح دولت مند بن جانے کی مریضانہ خواہش بہت عام تھی۔ اُسوقت لوگوں کو اس کی آزادی بھی حاصل تھی۔ اُسوقت کسی چیز کی قیمت کا انحصار ملکی اور قومی ضرورت پر نہیں تھا۔ دولت کے پجاریوں کو اس کی پرواہ نہیں تھی کہ اگر ملک کی تمام قوت محنت کسی ایک آدمی کے قبضہ میں آگئی تو اس سے پورے ملک کی حالت سدھرنے کی بجائے خراب ہوتی چلی جائیگی۔ وہ تو صرف اس بات پر نظر رکھتے تھے کہ بازار میں مانگ کس چیز کی ہے اور صرف وہی چیز بنانے کے لئے بڑے بڑے کارخانے کھولتے تھے۔ جن میں لاکھوں آدمی جانوروں کی طرح کام کرتے تھے۔ شراب، سگریٹ، افیون اگرچہ مضرت رساں اشیاء تھیں لیکن ان کو پیدا کرنے کے کام میں لاکھوں آدمی اور لاکھوں بیگھے زمین بیکار لگی رہتی تھیں۔ لیکن وہ صورت حال اب باقی نہیں رہی۔ موجودہ نظام میں قوت محنت زندگی کی تمام ضروری اور غیر نقصان وہ چیزوں اور آرام رساں اشیاء کی خاطر خواہ پیداوار میں صرف کی جاتی ہے اور کم سے کم وقت صرف کیا جاتا ہے تاکہ بقیہ وقت کو لوگ حسب مرضی اپنے پسندیدہ مشاغل میں لگا سکیں۔ مثلاً گذشتہ زمانہ میں دربھنگہ اور مظفرپور ضلعوں کی بہت سی زمینیں تمباکو پیدا کرنے میں لگی رہتی تھیں لیکن اب وہاں تمباکو نہیں پیدا ہوتا۔ سگار، سگریٹ اور بیڑی کے کارخانوں کا نام و نشان بھی نہیں۔ شراب اور افیون ہی نہیں بلکہ گانجا، بھنگ، چرس، تاڑی وغیرہ بہت سی چیزیں صرف عجائب خانوں میں مل سکتی ہیں یا کتابوں سے اُن کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چائے، کافی، قہوہ کو بھی اب بیکار یا بے فائدہ سمجھ کر رخصت کر دیا گیا ہے چونکہ امیری اور

غریبی کا سوال ہی نہیں رہا اس لئے ساراں، کودوں، مڑوال (راگی) اور موٹے چاول وغیرہ گئی ادنیٰ درجے کے اناج یکسر سے بوئے ہی نہیں جاتے، کھانے کے لئے پھل، اناج جو کچھ بھی پیدا کیا جاتا ہے وہ بہت اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ لباس، مکان، سواری اور باربرداری کے سلسلے میں بھی یہی بات ہے۔

سکوں کا رواج اُٹھ جانے اور ذاتی ملکیت کے نظام کے ختم ہو جانے کی وجہ سے پھل پھول، کھیتی باڑی، مشین، کارخانے اسب ملک کی ملکیت ہیں۔ اس لئے اب لتنے قوانین کی بھرمار نہیں رہی۔ انکم ٹیکس کا قانون، قانون بندوبست پیر کورٹ فیس، آبکاری کا شتکاری لگان، جوائنٹ اسٹاک کمپنی کے قوانین اور دوسری سینکڑوں چیزوں کے متعلق قوانین کی اب ضرورت ہی ختم ہو گئی۔ اس طرح دیوانی معاملات اور مقدمات کی جڑ ہی کٹ گئی کیونکہ دولت اور زمین پر ذاتی ملکیت نہیں رہی۔ فوجداری کے قوانین کے دفعات بھی اب بہت گھٹ گئے ہیں کیونکہ زر اور زمین سے متعلق جرائم کا اب امکان نہیں کسی آدمی کو جسمانی یا دماغی نقصان پہنچانے کے اسباب اب برائے نام رہ گئے کیونکہ ان سب کی جڑ وہی ذاتی ملکیت تھی۔ اعلیٰ تعلیم۔ جسمانی اور دماغی امراض کے علاج کا اعلیٰ انتظام، ہر قسم کے جسمانی اور دماغی امراض سے پاک تندرست اور صحت مند اولاد کا پیدا ہونا وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے اب اُن علاقوں میں بھی جرائم کا نام ونشان نہیں جہاں پہلے جرائم بکثرت ہوتے تھے۔ اب جرائم کے صرف دو ذرائع ہیں۔ انسانی فطرت کی وقتاً فوقتاً اُبھر آنے والی حیوانیت اور مرد و عورت کے تعلقات۔ لیکن پھر بھی پہلے کی طرح جرائم اتنی کثرت سے نہیں ہوتے۔ اسکی دو خاص وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ موجودہ دور میں انسان کے میلان طبع کی مکمل اصلاح و تربیت ہو گئی ہے۔ دوسرے مرد و عورت کو اب یکساں درجہ حاصل ہے آج کل عورت کو مرد پر اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا مرد کو عورت پر۔ دونوں خالص محبت کے رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں۔ آجکل زن وشو کا رشتہ محبت ہی سے استوار ہوتا ہے اور یہ

رشتہ اسی وقت تک قائم رہتا ہے جبتک محبت موجود ہے۔ اُدھر محبت رخصت ہوئی اور اِدھر یہ رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ اب میاں بیوی معاشی اعتبار سے ایک دوسرے کا سہارا نہیں لیتے۔ سماج کی مخالفت کا بھی خوف باقی نہیں رہا۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ وہ کتنے دنوں تک صرف دکھلانے کے لئے میاں بیوی بنے رہ سکتے ہیں۔ اس کا ایک یہ بھی نتیجہ ہے کہ پہلے کی طرح اب پوشیدہ ناجائز تعلقات کی زیادتی نہیں ہے۔

موجودہ دور میں بہت سے پیشوں کا بھی خاتمہ ہوگیا ہے۔ وکیل، مختار، سوختار، بیرسٹر ہی نہیں بلکہ موچی، بھنگی، طوائف، بھک منگے، پنڈے، بھانڈ، مجاور، قصائی، دوکاندار وغیرہ بھی اب نہیں رہے۔ خدمت گار، لونڈی، اور آقا کا وجود نہیں۔ بچپن کی شادی اور بے جوڑ شادی کا بھی رواج نہیں رہا۔ جہیز، ناچ تماشا، شاندار بارات ہاتھی، گھوڑے، پالکی، آتشبازی وغیرہ تمام چیزیں ماضی کی حماقتیں ہوکر رہ گئیں ہیں۔ دیوتاؤں کی پرستش اور پیروں کے نازنخرے پوجا، بلیدان اور قربانی کا بھی نام و نشان مٹ گیا۔ ذات پات کی تفریق، رنگ کی عصبیت باقی نہیں رہی۔ خاندانی امراض مثلاً دق، کوڑھ، دمہ، بواسیر، دیوانگی۔ آتشک وغیرہ سننے میں بھی نہیں آتے۔ ان امراض سے پچھلی صدیوں میں ملک کو سخت جدوجہد کرنی پڑی تھی تب کہیں جاکر نجات ملی۔ ان بیماریوں کے شکار مرد اور عورتوں کو سب سے پہلے جڑی بوٹی کے استعمال سے اولاد پیدا کرنے کے ناقابل بنا دیا گیا پھر اُن کے رہنے سہنے کا بھی علیحدہ انتظام کیا گیا۔ یہ کام بہت مشکل تھا اور اس میں دیر بھی لگی۔ لیکن جب ایکبار ملک نے اپنے مفاد سمجھ کر اس کام کو انجام دینے کا ارادہ کرلیا تو پھر وہ بغیر پایہ تکمیل تک پہنچے کب رہ سکتا تھا ملک کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ دنیا میں اندھے، لولے لنگڑے، بہرے، گونگے، کالے بدصورت اور اس امراض کے شکار تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتے۔

[م جہورل]